تدبّرِ قرآن

۴۹

الحجرات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— الفتح ——— کا ضمیمہ و تتمہ ہے۔ سورۂ فتح کی آخری آیت میں، تورات کے حوالہ سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ صفت جو وارد ہوئی ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (محمدؐ اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے لیے سخت اور باہمدگر نہایت مہربان ہوں گے) یہ پوری سورہ اسی ٹکڑے کی گویا تفسیر ہے۔ جہاں تک اس کی اہمیت کا تعلق ہے اس کی وضاحت سورۂ فتح کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ اس کی یہ اہمیت متقتضی ہوئی کہ اس کے وہ مضمرات یہاں وضاحت سے بیان کر دیے جائیں جن کا بیان کیا جانا اس وقت مسلمانوں کے معاشرے کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری تھا۔ یہ بات اپنے محل میں بیان ہو چکی ہے کہ قرآن میں احکام و ہدایات کا نزول حالات کے تقاضوں کے تحت ہوا ہے تاکہ لوگوں پر ان کی صحیح قدر و قیمت واضح ہو سکے، چنانچہ یہ سورہ بھی ایسے حالات میں نازل ہوئی ہے جب نئے نئے اسلام میں داخل ہونے والوں کی طرف سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جن سے ظاہر ہوا کہ یہ لوگ نہ تو رسول کے اصلی مرتبہ و مقام ہی سے اچھی طرح واقف ہیں اور نہ اسلامی معاشرہ کے اندر اپنی ذمہ داریوں ہی سے۔ چنانچہ اس ضمیمہ میں ضروری ہدایات دے دی گئیں جو اس وقت کے حالات کے اندر ضروری تھیں۔ ان احکامات و ہدایات کا تعلق تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے باہمی حقوق ہی سے ہے۔ کفار کا معاملہ اس میں زیر بحث نہیں آیا۔ ان کے ساتھ مسلمانوں کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے اس کی وضاحت پچھلی سورتوں میں ہو چکی ہے۔

سورہ کے تیسرے گروپ میں جس نوعیت کا تعلق سورۂ نور کا سورۂ مومنون کے ساتھ ہے اسی نوعیت کا تعلق اس سورہ کا سورۂ فتح کے ساتھ ہے۔ دونوں کا مزاج باہمدگر بالکل ملتا جلتا ہوا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو رسول کی رائے یا آپ کے حکم پر مقدم کرنے کی کوشش کرے یا گفتگو میں اپنی آواز کو آپ کی آواز پر بلند کرے یا آپ کو اس طرح پکارے جس طرح اپنے کسی مساوی درجہ کے آدمی کو پکارتا ہے۔ تقویٰ کی افزائش اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے دلوں کے اندر کرتا ہے جو اس کے رسول کے ادب و احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رسول اور اسلام کا محسن سمجھتے ہیں اور رسول کے سامنے خطاب و کلام میں اپنے تفوق کا اظہار کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیے کہ اس طرح کی حرکت سے غیر شعوری طور پر وہ اپنے اعمال ہی نہ گنوا بیٹھیں۔

(۶-۱۰) مسلمانوں کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ اخوت کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ پارٹی اور گروہی عصبیت کی بنیاد پر۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمان مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف اقدام کر ڈالیں، جس پر بالآخر انھیں پچھتانا پڑے۔ تمام اہم معاملات میں رسول کی صوابدید اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ کسی پارٹی کو رسول کی حمایت اپنے حق میں حاصل کرنے کے لیے اس پر غلط قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ چیز اس فضل و انعام کی ناقدری ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی شکل میں اہل ایمان کو نوازا ہے۔ ایمان کا مزا چکھ لینے کے بعد کوئی ایسی بات کرنا جو اس کے منافی ہے کفر و عصیان کی طرف رجعت ہے جس سے لوگوں کو بچانے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کو دلوں میں رچانے اور کفر کو مبغوض بنانے کے لیے سارے جتن کیے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گروہی رجحانات کی بنا پر ان میں سے کسی گروہ کے ساتھی بن جائیں بلکہ انھیں معاملہ کو حق و انصاف کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کے درمیان اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ حق و عدل کا پہلو متعین ہو جانے کے بعد اگر ان میں سے کوئی گروہ اس حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو تو اس کو بزور اس کے آگے جھکنے پر مجبور کرنا چاہیے۔

(۱۱-۱۳) ان باتوں سے بچنے کی ہدایت جو دلوں میں نفرت کی تخم ریزی اور معاشرے میں فساد کی آگ بھڑکانے والی ہیں۔ کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے کی تحقیر کرے یا اس کا مذاق اڑائے یا اس کو عیب لگائے یا اس پر پھبتیاں چست کرے یا اس کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرے یا اس کی غیبت کرے یا اس کے عیوب کی ٹوہ میں لگے۔ حسب نسب اور خاندان و قبیلہ کا غرور

جاہلیت کی یادگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو ایک ہی آدم وحوا سے پیدا کیا ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے نہ کہ نسب اور خاندان۔

(۱۴-۱۸) خاتمۂ سورہ، جس میں اس بات کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے جو سورہ کی تمہید میں اشارات کی شکل میں، فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابتدائی آیات میں جن لوگوں کا رویہ زیر بحث آیا ہے یہ اطراف مدینہ کے وہ اہل بدو تھے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح اترا نہیں تھا اس وجہ سے وہ اس پندار میں مبتلا تھے کہ اسلام لا کر انھوں نے اسلام اور پیغمبرؐ پر ایک احسان کیا ہے۔ ان کے اس پندار کا اظہار بعض اوقات اس طرح کی حرکتوں سے ہو جاتا تھا جن سے ابتدائی آیات میں مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ اب یہ آخر میں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ ان کو بتا دو کہ وہ اپنے ایمان واسلام کا احسان نہ جتائیں۔ اللہ ان کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔ انھوں نے اطاعت تو ضرور کر لی ہے لیکن ابھی ایمان نے ان کے اندر جڑ نہیں پکڑی ہے۔ یہ ان کا احسان نہیں ہے کہ وہ پیغمبرؐ پر ایمان لائے بلکہ یہ اللہ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے ان کو ایمان کی توفیق بخشی۔ اگر وہ اس کا حق ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

سُورَةُ الْحُجُرَاتِ (٤٩)

مَدَنِيَّةٌ ——— آيات ١٨

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

آيات يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَ
١-١٠ رَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١﴾ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ
وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ
أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ
أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ
اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٣﴾
إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا
يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ
خَيْرًا لَهُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ
جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ
فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ﴿٦﴾ وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ
رَسُولَ اللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ

اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیۡكُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَ كَرَّهَ اِلَیۡكُمُ
الۡكُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ﴿۷﴾
فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعۡمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَكِیۡمٌ ﴿۸﴾ وَ اِنۡ طَآئِفَتٰنِ
مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ
اِحۡدٰىهُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡٓءَ
اِلٰۤی اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا
بَیۡنَ اَخَوَیۡكُمۡ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۰﴾ ع ۱ ۱۰ ۱۳ ۲۶

ترجمہ آیات ۱ — ۱۰

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ اور رسول کے سامنے اپنی رائے مقدم نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱

اے ایمان لانے والو! تم اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو مبادا تمہارے اعمال ڈھے جائیں اور تم کو احساس بھی نہ ہو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ نبی کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ ۲ - ۳

بے شک جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ رکھنے والے نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ صبر کے ساتھ اتنا انتظار کر لیتے کہ تم خود

ان کے پاس نکل کے آجاتے تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۴-۵

اے ایمان لانے والو! اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو مبادا کسی قوم پر نادانی سے جا پڑو، پھر تمھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔ اور اچھی طرح جان رکھو کہ تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر بہت سے معاملات میں وہ تمھاری بات مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے لیکن اللہ نے تمھارے سامنے ایمان کو محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں کھبایا اور کفر و فسق اور نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں مبغوض کیا۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے فضل و انعام سے راہ راست پانے والے بنے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ ۶-۸

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کراؤ پس اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تعدّی کرے تو اس سے جنگ کرو جو تعدّی کرے تا آنکہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرا دو اور ٹھیک ٹھیک انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ مسلمان باہمد گر بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں کے مابین مصالحت کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۹-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۱)

وہ حالات جن میں یہ سورہ نازل ہوئی

خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن جن لوگوں کا رویّہ اس سورہ میں زیرِ بحث آیا ہے وہ، جیسا کہ آگے کی آیات سے بالتدریج واضح ہوتا جائے گا، اطرافِ مدینہ کے بدوی قبائل کے وہ لوگ ہیں جو اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن ابھی ایمان ان کے دلوں میں اچھی طرح رچا بسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ اوّل تو یہ تھی کہ یہ لوگ اسلام کو سمجھ کر نہیں بلکہ اس سے مرعوب ہو کر اس میں داخل ہوئے، ثانیاً مرکز سے بے تعلق رہنے کے سبب سے ان کی تربیت بھی اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ ان کے اندر ایک غلط قسم کا پندار بھی تھا کہ انھوں نے کسی جنگ کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر لی جو آپ پر ان کا ایک احسان ہے۔ اس پندار کا اثر یہ تھا کہ ان کے سردار جب مدینہ آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس انداز سے بات کرتے گویا وہ اسلام کے بڑے مربی و محسن ہیں۔ بغیر اس کے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے میں ان کی رائے دریافت کریں آگے بڑھ بڑھ کر اپنی رائیں پیش کرتے اور مشورے دینے کی کوشش کرتے۔ بات کرتے ہوئے حضورؐ کی آواز پر اپنی آواز، تفوّق کے اظہار کے لیے بلند رکھتے۔ جب کبھی آتے تو ان کی خواہش یہ ہوتی کہ حضورؐ بلا تاخیر سارے کام چھوڑ کر، ان سے ملاقات کریں اور اگر ذرا تاخیر ہو جاتی تو بے دھڑک آپ کو حجروں کے باہر سے اس طرح آواز دینا شروع کر دیتے جس طرح ایک عام آدمی کو آواز دی جاتی ہے۔ آپس میں ان کے درمیان جو جاہلی رقابتیں زمانۂ جاہلیت سے چلی آ رہی تھیں، ان میں ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتا اور اس غرض کے لیے وہ اپنے حریفوں سے متعلق بعض اوقات ایسی خبریں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے جو غلط فہمی پیدا کرنے والی ہوتیں۔ ان کی بنا پر مدینہ کے مسلمان اگر کوئی اقدام کر گزرتے تو یہ چیز مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے نہایت مضر ہوتی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ نازل ہوئی۔ اس میں رویّہ تو زیرِ بحث، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک مخصوص گروہ ہی کا ہے لیکن قرآن نے خطاب عام ہی رکھا ہے تاکہ اس کا زیادہ فضیحتا بھی نہ ہو اور وہ رخنے بند بھی ہو جائیں جن سے شیطان کو معاشرہ کے اندر فتنہ انگیزی کی راہ مل سکتی ہے۔

ممانعت رسول کے سامنے رائے پیش کرنے کی نہیں بلکہ رائے پیش کرنے میں پہل کرنے کی ہے

یہ امر واضح رہے کہ یہاں ممانعت اللہ کے رسول کے سامنے اپنی رائے پیش کرنے میں پہل کرنے یا اپنی رائے کو اللہ اور رسول کے حکم پر مقدم کرنے کی ہے نہ کہ رسول کے سامنے مجرّد اپنی کوئی رائے پیش کرنے کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امورِ مصلحت میں صحابہؓ سے ان کی رائیں معلوم بھی فرماتے اور صحابہؓ اپنی رائے پیش بھی کرتے۔ اسی طرح صحابہؓ بعض اوقات عام امورِ مصلحت میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے یہ بھی عرض کرتے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فلاں اقدام وحی الٰہی پر مبنی نہ ہو تو اس کی جگہ فلاں تدبیر زیادہ قرینِ مصلحت رہے گی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ان کی رائیں قبول بھی فرما لیتے۔ اس آیت میں اس طرح کی باتوں کی نہی نہیں ہے۔ حضورؐ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ سب سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی، جیسا کہ آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) سے واضح ہے، آپ کو لوگوں سے مشورہ کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی گئی تھی۔

یہاں ممانعت، اسی بات کی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ کوئی شخص اللہ کے رسول کو ایک عام آدمی یا مجرد ایک لیڈر سمجھ کر اور اپنے آپ کو ان سے زیادہ مدبّر خیال کر کے، بغیر اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کسی معاملہ میں اس کی رائے دریافت کریں، حضورؐ کو اپنی رائے سے متاثر کرنے اور اپنی رائے کو حضورؐ کی بات پر مقدم کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس کا رویہ دلیل ہے کہ وہ رسول کے اصلی مرتبہ و مقام سے بالکل بے خبر ہے۔ اللہ کا رسول اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کرتا یا کہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنے کی جسارت کرتا ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنی رائے کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر مقدم کرنا چاہتا ہے درآنحالیکہ یہ چیز اس کے تمام ایمان و عمل کو ڈھا دینے والی ہے اگرچہ اس کو اس کا شعور نہ ہو۔

اللہ اور رسول
کا معاملہ الگ
الگ نہیں ہے

بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ و رسول کا معاملہ الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کا رسول اللہ کا سفیر و نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کو بن پوچھے مشورہ دینا خود اللہ تعالیٰ کو مشورہ دینا ہے، اس کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا اللہ کی بات پر اپنی بات کو مقدم کرنا ہے اور اس سے بڑھ کر اپنے کو مدبّر سمجھنا خود خدائے علیم و حکیم سے بڑھ کر اپنے کو مدبّر و حکیم سمجھنا ہے۔ یہ آدمی کے اس رویّہ کے لازمی نتائج ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو اس کی بلادت کے سبب سے ان نتائج کا احساس نہ ہو لیکن ان کے لازمی نتائج ہونے سے انکار ناممکن ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ اور رسول سے زیادہ دانشمند اور مدبّر ہونے کے خبط میں مبتلا نہ ہو۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ وہ تمہاری ساری باتوں کو سن بھی رہا ہے اور ان کے پیچھے جو محرکات کام کر رہے ہیں ان سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا مکافاتِ عمل کا قانون لازماً ظہور میں آئے گا۔ اس قانون کا ذکر آگے والی آیت میں آرہا ہے۔

موجودہ زمانے کے مدعیان
اصلاح کی کج فہمی

اس آیت میں ہمارے زمانے کے ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو اسلام کی خدمت کے دعوے

کے ساتھ اس کے اقتدار کو منسخ اور اس کے قوانین کی تحریف کر رہے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جس شکل میں اسلام دیا ہے اس شکل میں وہ اس دور میں نہیں چل سکتا۔ ضروری ہے کہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اس کی اصلاح کی جائے۔ چنانچہ وہ شریعت کے احکام میں اپنی رائے کے مطابق ترمیم کر رہے ہیں۔ بس یہ فرق ہے کہ آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو پہلے ہی سے سبقت کر کے چاہتے تھے کہ اللہ و رسول کے آگے اپنے مشورے پیش کر دیں، اس زمانے کے مدعیان اسلام کو یہ موقع نہ مل سکا اس وجہ سے وہ اب ان غلطیوں کی اصلاح کر رہے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ و رسول سے 'العیاذ باللہ' دین کے معاملے میں ہو گئی ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲)

جن کے اندر پندار ہو اس کا اظہار ان کے انداز کلام سے نمایاں ہوتا ہے

یہ اسی اوپر والی بات کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے جن لوگوں کے اندر یہ خناس سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول کو مشورہ دینے کے پوزیشن میں ہیں یا جن کو یہ زعم ہو کہ ان کا اسلام قبول کر لینا اسلام اور پیغمبرؐ پر ایک احسان ہے۔ ان کا طرزِ خطاب اور اندازِ کلام رسول کے آگے متواضعانہ و نیازمندانہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ ان کے اس پندار کا اثر ان کی گفتگو سے نمایاں ہونا ایک امرِ فطری تھا۔ چنانچہ یہ لوگ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے تو ان کے انداز کلام سے یہ واضح ہوتا کہ یہ اللہ کے رسول سے کچھ سیکھنے نہیں بلکہ ان کو کچھ سکھانے اور بتانے آئے ہیں۔ چنانچہ جس طرح یہ اپنی رائیں پیش کرنے میں سبقت کرتے اسی طرح ان کی کوشش یہ بھی ہوتی کہ ان کی آواز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بلند و بالا رہے اور اگر آپ کو مخاطب کرتے تو ادب سے 'یا رسول اللہ' کہنے کے بجائے 'یا محمدؐ' کہہ کر خطاب کرتے جس طرح اپنے برابر کے ایک عام آدمی کو خطاب کیا جاتا ہے۔ یہاں ان کو اس غیر مہذب طریقۂ کلام و خطاب سے روکا گیا ہے کیونکہ یہ چیز غمازی کر رہی تھی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ رسول کا اصل مرتبہ و مقام نہیں پہچانا ہے بلکہ ان کے اندر اپنی برتری کا وہ زعم بھی چھپا ہوا ہے جو بالآخر اُن کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے والا ہے۔

'اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ' میں 'اَنْ' سے پہلے، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں 'کراهة' یا 'مخافة' یا ان کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہو گا کہ اس بے ادبی سے تمھیں اس لیے روکا جا رہا ہے کہ مبادا تمھاری یہ حرکت اس بات کا سبب بن جائے کہ عنداللہ تمھارے سارے اعمال ڈھے جائیں۔

'وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ' یعنی تم تو اس پندار میں مبتلا رہو گے کہ تم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور نبیؐ کو اپنی رایوں سے مستفید کرنے کے لیے تمھاری بے چینی بھی خدمتِ دین ہی کے عشق

یں ہے لیکن ادھر تمہارے وہ سارے اعمال ڈھے جائیں گے جو اپنے زعم میں تم نے دین کی خاطر انجام دیے اور تمہیں اس بات کا شعور بھی نہ ہوگا ۔

ایک نہایت اہم حقیقت

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ایک شخص بہت سے کام اپنی دانست میں دین کے کام سمجھ کر دین ہی کی خدمت کے لیے کرتا ہے لیکن اس کے اندر اگر یہ پندار سمایا ہوا ہو کہ وہ اللہ و رسول پر یا اللہ کے دین پر کوئی احسان کر رہا ہے اور اس زعم میں نہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح عظمت کو ملحوظ رکھے، نہ اس کے رسول کے اصلی مرتبہ و مقام کا احترام کرے تو اس کے سارے اعمال اکارت ہو کے رہ جائیں گے اور اس کو اپنی اس بے شعوری کا پتہ آخرت میں چلے گا ۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن سمجھ بیٹھے ۔ اس کے ہاں قبولیت کا شرف صرف انہی لوگوں کے اعمال کو حاصل ہوگا جو اس کے دین کی خدمت صرف اس کی رضا کے لیے، ٹھیک ٹھیک اس کے مقرر کردہ شرائط کے مطابق، انجام دیں گے اور ساتھ ہی دل سے اس حقیقت کے معترف رہیں گے کہ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے اللہ و رسول پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ یہ اللہ کا فضل و احسان خود ان کے اوپر ہوا ہے کہ اس نے ان کو اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق بخشی ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ (٣)

رسول کے معاملے میں صحیح ادب کی تعلیم

یہ اس صحیح ادب کی تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں ہر صاحب ایمان کو اختیار کرنا لازم ہے ۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب فرمایا ہے لفظ 'امتحن' یہاں 'اصطفٰی' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر دل تقویٰ کی تخم ریزی اور اس کی افزائش کے لیے موزوں نہیں ہوتا بلکہ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ امتحان کر کے دلوں کا انتخاب کرتا ہے اور اس انتخاب میں اصل چیز جو ترجیح دینے والی بنتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر اللہ و رسول کے لیے انقیاد و اطاعت کا سچا جذبہ اور ان کے آگے فروتنی کا صحیح شعور ہے یا نہیں ۔ یہ چیز جس کے اندر جتنی ہی زیادہ ہوتی ہے اس کو اتنی ہی زیادہ تقویٰ کی نعمت عطا ہوتی ہے اور جو لوگ جس درجے میں اس شعور سے عاری ہوتے ہیں وہ اتنے ہی تقویٰ سے بعید ہوتے ہیں ۔ آواز بلند کرنے کا ذکر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، انسان کے باطن کے ایک مخبر کی حیثیت سے ہوا ہے ۔ جو شخص کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کا یہ عمل شہادت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اونچا خیال کرتا ہے

یہ چیز اکتسابِ فیض کی راہ بالکل بند کر دیتی ہے۔ اگر استاد کے آگے کسی شاگرد کا یہ طرزِ عمل ہو تو وہ اس کے فیض سے محروم رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کے رسول کے آگے کسی نے یہ روش اختیار کی تو وہ صرف رسول ہی کے فیض سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی محروم ہو جائے گا اس لیے کہ رسول، اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔

کتاب و سنت کے فیوض سے بہرہ مند ہونے کے لیے صحیح رویہ

یہی درجہ اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب فرماتا ہے جو اس کی کتاب، اور رسول کی سنت کے سامنے فروتنی کی یہی روش اختیار کرتے ہیں جس کی ہدایت رسول کے معاملے میں ہوئی ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ و رسول کی ہر بات کے آگے سر جھکا دینے کا سچا جذبہ ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے تقویٰ کی راہیں کھولتا ہے اور ہر قدم پر غیب سے اس کی رہنمائی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی اصلاح کرنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کا یہ پندار اس کے سارے عمل کو غارت اور اس کی آخرت کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ: اوپر والی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے کا انجام یہ بتایا ہے کہ یہ روش اعمال کو برباد کر دینے والی روش ہے۔ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اپنی آواز رسول کے آگے پست رکھیں گے۔ فرمایا کہ ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے۔ یعنی ان کی لغزشیں اور کوتاہیاں اللہ تعالیٰ بخش دے گا اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے آگے فروتنی کی روش اختیار کی۔ کسی گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھنے کی جسارت نہیں کی۔ ان کی اس فروتنی کا انعام ان کو یہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کی افزائش کے لیے منتخب فرمایا جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۴)

کم عقلوں کے ایک ناشائستہ طریقہ پر ان کو تنبیہ

یہ لوگ جس طرح مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے میں غیر مہذب تھے اسی طرح یہ حرکت بھی وہ کرتے کہ جب دیکھتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں موجود نہیں ہیں تو آتے ہی ازواجِ مطہرات رضؓ کے حجروں کے باہر ہی سے آپ کو چیخ چیخ کر پکارنا شروع کر دیتے۔ اس قسم کی حرکت بجائے خود بھی نہایت ناشائستہ ہے لیکن اس کا باطنی محرک اس کے ظاہر سے بھی زیادہ مکروہ تھا۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اور آگے اس کی پوری وضاحت آئے گی، اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر لڑے بھڑے جو اسلام قبول کر لیا تو یہ اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا بہت بڑا احسان ہے اس وجہ سے یہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ جب یہ آئیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بلا تاخیر ان کا خیر مقدم کریں۔ اگر کسی وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما نہ ہوتے تو انتظار کی زحمت گوارا

نہ کرتے بلکہ فوراً ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کا چکر لگانا اور چیخ چیخ کر نہایت بھونڈے طریقے سے، آپ کا نام لے لے کر، پکارنا شروع کر دیتے۔ فرمایا کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ کے الفاظ میں ان لوگوں کی ناسمجھی پر ملامت بھی ہے اور لطیف انداز میں ان کی اس نادانی سے درگزر کرنے کا اشارہ بھی کہ ہر چند ہے تو ان کی یہ حرکت نہایت ناشائستہ لیکن ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام سے آشنا ہیں اور نہ اپنی اس حرکت کے انجام سے، اس وجہ سے یہ تربیت کے محتاج اور درگزر کے لائق ہیں۔

مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ میں لفظ 'وَرَآءِ' جو آیا ہے اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ حجروں کے پیچھے سے پکارتے تھے اس وجہ سے ان کی یہ حرکت قابلِ اعتراض ٹھہری۔ لفظ 'وَرَآءَ' پیچھے یا پچھواڑے کے مفہوم کے لیے خاص نہیں ہے۔ عربی میں وَنَادَانِیْ مِنْ وَّرَآءِ الدَّارِ، کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ اس نے گھر کے باہر سے مجھے پکارا، قطع نظر اس سے کہ مکان کے پیچھے سے پکارا یا مکان کے سامنے سے۔ قابلِ اعتراض ان کا اس بھونڈے طریقہ سے پکارنا تھا۔ یہ امر واضح رہے کہ ایک عام مسلمان کو بھی اس طرح پکارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو۔ سورۂ نور کی تفسیر میں وہ طریقہ آپ پڑھ آئے ہیں جو کسی صاحبِ خانہ سے ملاقات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵)

یہ ان کو صحیح ادب کی ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ صبر کے ساتھ تمہارے نکلنے تک انتظار کر لیتے تو یہ چیز ان کے لیے بڑے خیر و برکت کا موجب ہوتی! آیت کا اسلوب ان کی محرومی پر اظہارِ حسرت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس چشمۂ فیض پر پہنچے تھے اگر انھوں نے اس کی صحیح قدر پہچانی ہوتی تو اس سے سیراب ہو کر لوٹتے لیکن یہ ان کی محرومی ہے کہ وہاں سے کچھ پانا تو درکنار اپنی نادانی و ناقدرشناسی کے باعث یہ کچھ کھو کے پلٹے!

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صفات 'غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' کی یاددہانی فرمائی ہے اور مقصود اس سے نہایت لطیف انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اگرچہ ان کی یہ حرکتیں نہایت ناگوار ہیں لیکن یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں اس وجہ سے ابھی ان کی اس طرح کی باتوں سے درگزر کرو۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور یہی عفو و درگزر اس کے رسول کے بھی شایانِ شان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (۶)

خبر کے قبول کرنے کے معاملے میں احتیاط کی تاکید

یہ مرکز (یعنی مدینہ) کے مسلمانوں کو اس طرح کے لوگوں کی طرف سے ایک سیاسی خطرہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ اطرافِ مدینہ کے بدوی قبائل کے بعض سرداروں کا رویہ بیان ہوا ہے۔ ان کے اندر تربیت سے محرومی کے باعث جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا صحیح شعور مفقود تھا اسی طرح اسلامی اخوت کے صحیح احساس سے بھی یہ لوگ ابھی نا آشنا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے اندر جو رقابتیں اور رنجشیں آپس میں تھیں ان کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ یہ لوگ مدینہ آتے تو ان میں سے بعض اپنے حریفوں کے خلاف غلط صحیح اطلاعات دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بدگمان کرنے کی کوشش کرتے اور صحابہؓ میں سے بھی، جن پر ان کا اثر کارگر ہوتا، ان کو اپنے حق میں ہموار کرتے تاکہ مدینہ کی مرکزی طاقت، کو اپنے حریفوں کے خلاف، اپنے حق میں استعمال کر سکیں۔ یہ صورتِ حال ایک نازک صورتِ حال تھی۔ مدینہ کی حکومت اول تو ابھی اچھی طرح مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً اس قسم کی بے بنیاد افواہ انگیزیوں کی بنا پر اس کا کوئی اقدام خاص طور پر مسلمانوں ہی کے کسی گروہ کے خلاف، عدل اور اجتماعی مصلحت دونوں کے خلاف ہوتا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ مرکز کے مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی جائے کہ وہ اس طرح کے اہم معاملات میں فیصلہ کلیتہً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب دید پر چھوڑیں، غیر ثقہ لوگوں کی روایات پر اعتماد کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رائے سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ ان کو ہدایت ہوئی کہ اگر کوئی فاسق شخص کسی اہم بات کی خبر دے تو نفسِ واقعہ کی اچھی طرح تحقیق کیے بغیر اس کی بات پر اعتماد کر کے کوئی اقدام نہ کر بیٹھو، مبادا کہ تم جوش و جذبہ سے مغلوب ہو کر کسی بے گناہ گروہ کے خلاف اقدام کر گزرو جس پر تمھیں بعد میں پچھتانا پڑے۔

فاسق سے مراد شریعت کے حدود و قیود سے بے پروا لوگ ہیں۔ لفظ 'نبأ' کی تحقیق اس کے محل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سے مراد کوئی اہم خبر ہوتی ہے جس کو باور کر لینے یا اس پر عمل کرنے سے دور رس نتائج کے پیدا ہونے کا امکان ہو۔ اس طرح کی اہم خبر اگر کوئی ایسا شخص دے جو دینی و اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہو تو عقل اور اخلاق دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی بات، اس وقت تک باور نہ کی جائے جب تک خبر اور مخبر دونوں کی اچھی طرح تحقیق نہ کر لی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ خبر دینے والے نے فاسد محرکات کے تحت خبر دی ہو اور خبر یا تو بالکل جھوٹی ہو یا کسی بدنیتی سے اس میں ایسی کمی بیشی کر دی گئی ہو کہ سننے والوں کے جذبات میں اس سے جوش و اشتعال پیدا ہو۔ لفظ 'جہالت'، یہاں جوش و ہیجان کے معنی میں ہے۔ اس کی تحقیق جگہ جگہ اس کتاب میں ہم کر چکے ہیں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۙ﴿۷﴾ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعۡمَۃً ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۷-۸﴾

صحیح رویہ

یہ اسی تنبیہ کی مزید تاکید ہے کہ جب تمھارے اندر اللہ کا رسول موجود ہے تو تمھیں اپنی رایوں اور اپنے مشوروں کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے کہ رسول کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کرو بلکہ تمھیں ان کے پیچھے چلنا ہے۔ وہ جو قدم بھی اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اٹھاتے ہیں اس وجہ سے تمھاری دنیا اور آخرت کی فلاح ان کی پیروی میں ہے نہ کہ اپنے جذبات کی پیروی میں۔ اگر تمھیں کوئی رائے پیش کرنی ہو تو ادب سے اپنی رائے پیش کر کے فیصلہ رسول کی صوابدید پر چھوڑ دو یہ خواہش نہ کرو کہ تمھاری ہر رائے لازماً مان ہی لی جائے۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ تمھاری بہت سی رائیں خام ہوتی ہیں، اللہ کا رسول ان سب کو اگر مان لیا کرے تو تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے وہ تمھاری انہی رایوں کو مانتے ہیں جو صائب ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت تمھیں ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کی رہنمائی حاصل ہے تو اس نعمت کی قدر کرو اور اپنے رب کے شکرگزار رہو۔

'عنت' کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں۔ 'لَعَنِتُّمۡ' یعنی تم بڑی مشقت و مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اگر کوئی مریض طبیب کی صوابدید پر عمل کرنے کے بجائے چاہے کہ طبیب اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو تو ایسے مریض کا خطرے میں پڑ جانا ایک امر بدیہی ہے۔

زبان کے بعض لطائف

'وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَکَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡیَانَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس زحمت و مشقت سے بچانے ہی کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ایمان کو تمھاری نگاہوں میں محبوب بنایا اور اس کو تمھارے دلوں میں رچا بسا دیا اور کفر، فسق اور عصیان کو تمھاری نگاہوں میں مکروہ و مبغوض ٹھہرایا تو اس اہتمام کا حق یہ ہے کہ اب تمھارے اندر ایمان کی محبت و محبوبیت قائم و دائم رہے اور کبھی تمھارے کسی قول و فعل سے اس پر کفر و عصیان کا کوئی دھبہ نہ پڑنے پائے۔

'حَبَّبَ' اور 'کَرَّہَ' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس اہتمام خاص کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کی نگاہوں میں ایمان کو محبوب اور کفر و فسق کو مبغوض بنانے کے لیے اپنے رسول کے ذریعہ سے فرمایا۔ دورِ جاہلیت کی تاریکی میں تمام اقدار بالکل تلپٹ ہو گئے تھے۔ شیطان نے ایمان کو لوگوں کی نگاہوں میں مکروہ و مبغوض اور کفر و فسق کو محبوب و مطلوب بنا دیا تھا۔ ایمان اس طرح تہ بہ تہ پردوں کے اندر محجوب و مستور ہو گیا تھا کہ ان کو چاک کر کے ایمان کے حقیقی حسن و جمال کو خلق کے لیے بے نقاب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف بن گیا تھا۔ اسی طرح کفر کو شیطان نے مصنوعی غازوں سے اس طرح

پُرفریب بنا دیا تھا کہ اس کی اصل گھنونی شکل وصورت لوگوں کو دکھانا ہفت خواں طے کرنے کے برابر تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوئی کہ اس نے اپنا رسول بھیجا جس نے ایک طویل جدوجہد اور جہاد کے بعد ایمان کو اس کی اصلی محبوب شکل میں لوگوں کو دکھایا اور اس کے جمال کو ان کے دلوں میں بسایا۔ اسی طرح کفر کے چہرے کے مصنوعی غازہ کو اتار کر اس کی اصل مکروہ اور گھنونی شکل سے لوگوں کو آشنا اور اس سے بیزار کیا۔ اسی مضمون کو یہاں 'حَبَّبَ اِلَیْ' اور 'کَرَّہَ اِلَیْ' کے الفاظ سے ادا فرمایا ہے۔ یعنی ایمان اور کفر دونوں کو ان کی حقیقی شکل وصورت میں تمھارے آگے پیش کیا جس سے تم ایمان کے دلدادہ بنے اور کفر سے بیزار ہوئے۔ گویا یہ دونوں فعل 'قدم' کے مضمون پر متضمن ہیں اور حرف 'اِلیٰ' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہاں 'حَبَّبَ' کے مفعول کی حیثیت سے تو صرف 'ایمان' کا ذکر ہے لیکن 'کَرَّہَ' کے ساتھ کفر، فسق اور عصیان تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جن لوگوں کے کردار پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ابھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان باتوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے جو ایمان کی ضد میں۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان کو وضاحت سے یہ بات بتائی جائے کہ صرف کفر ہی ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ فسق وعصیان کے قسم کی ساری باتیں بھی اسی شجرۂ ملعونہ کے برگ وبار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی مبغوض ٹھہرایا۔

لفظ 'فسق'، یوں تو قرآن میں کفر کی جگہ بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہاں چونکہ یہ کفر کے ساتھ آیا ہے اس وجہ سے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ حکم عدولی ہوگی جس کا ارتکاب کوئی شخص ایمان کا مدعی ہوتے ہوئے کرے۔ لفظ 'عصیان' یہاں موقع ومحل اشارہ کر رہا ہے کہ رسول کی نافرمانی کے لیے آیا ہے۔ رسول کے خلفاء وامراء کی نافرمانی بھی چونکہ بالواسطہ رسول ہی کی نافرمانی ہے اس وجہ سے یہ چیز بھی اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔

'اُولٰٓئِکَ ھُمُ الرّٰشِدُوْنَ ہ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ'۔ فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے دلوں میں ایمان کا جمال گھر کیے ہوئے ہے اور جو کفر، فسق اور عصیان کے ہر شائبہ سے بیزار و نفور ہیں، درحقیقت اصل ہدایت پر ہیں اور یہ ہدایت ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے انعام سے حاصل ہوئی ہے اس وجہ سے ان کو اس پر اپنے رب ہی کا شکرگزار رہنا چاہیے۔ تمام کاروں کی طرح اس وہم میں کسی کو نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ اس کو یہ چیز از خود مل گئی ہے اور وہ خدا اور رسول کا کوئی محسن بن گیا ہے۔ 'علیمٌ حکیمٌ' کی صفات کا حوالہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل اس کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی تقسیم کسی اندھے کی تقسیم نہیں ہے۔ وہ اپنے دین کی نعمت انہی کو دیتا ہے جن کو وہ اس کا اہل

پاتا ہے۔

یہ آیت مدینہ کے مسلمانوں کی تعریف میں ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے برابر فیضیاب اور اللہ کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے تھے اور سیاق و سباق دلیل ہے کہ اس میں ان خام کار مسلمانوں پر تعریض بھی ہے جن کی خامیوں پر سورہ کی ابتدا ہی سے تبصرہ ہو رہا ہے اور جن کا تعلق اطرافِ مدینہ کے قبائل سے تھا۔

ایک بے بنیاد شانِ نزول

آیت ۶ کے تحت ہمارے مفسرین نے، اپنی عادت کے مطابق، ایک شانِ نزول کا بھی ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو تحصیل زکوٰۃ کے لیے بنی مصطلق کے پاس بھیجا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو بنی مصطلق کے لوگ بشکلِ جلوس ان کے خیر مقدم کے لیے نکلے۔ ولید نے گمان کیا کہ یہ لوگ ان سے لڑنے کو نکلے ہیں۔ وہ ڈر کر فوراً وہاں سے واپس آگئے[1] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا۔ یہ خبر سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنی مصطلق پر نہایت برہم ہوئے اور ان کی سرکوبی کے لیے آپؐ نے ایک دستہ بھیج دیا یا بھیجنے کا فیصلہ فرما لیا کہ اتنے میں بنی مصطلق والوں کو اطلاع ہوگئی اور ان کے سردار نے فوراً مدینہ حاضر ہو کر بقید قسم حضورؐ کو اطمینان دلایا کہ ہم نے تو ولید کی شکل بھی نہیں دیکھی، زکوٰۃ روکنے کا کیا سوال! ان کی طرف سے صفائی کے بعد ان کا معاملہ تو رفع دفع ہو گیا لیکن ہمارے مفسرین کے نزدیک ولیدؓ کی اسی روایت کی بنا پر یہ آیت اتری اور مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے کوئی عاجلانہ قدم نہ اٹھایا کریں۔

ہمارے مفسرین کوئی نہ کوئی شانِ نزول تو تقریباً ہر آیت کے تحت درج کرتے ہیں، اوپر آیت 'اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ .... الآیۃ' کے تحت بھی انھوں نے ایک شانِ نزول کا حوالہ دیا ہے لیکن اس سے ہم نے اس وجہ سے تعرض نہیں کیا کہ بعض ناقدین نے اس پر جرح بھی کر دی ہے مگر اس شانِ نزول پر سب متفق ہیں اس وجہ سے اس سے تعرض ناگزیر ہے۔

شانِ نزول سے متعلق وہ اصولی حقیقت ہمیشہ مستحضر رکھیے جس کا ذکر ہم نے مقدمۂ تفسیر میں کیا ہے کہ سلف کسی آیت کے تحت اگر کسی واقعہ کا ذکر شانِ نزول کی حیثیت سے کرتے ہیں تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ بعینہٖ وہی واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب ہوا ہے بلکہ اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ آیت سے اس واقعہ کا حکم بھی مستنبط ہوتا ہے۔ یہ رائے اصولِ تفسیر

---

[1] بعض راویوں کا بیان ہے کہ ڈرے نہیں بلکہ ان کے دل میں پہلے سے بنی مصطلق کے خلاف رنجش تھی اسی وجہ سے ان سے ملے بغیر واپس آگئے اور یہ بات بنائی کہ انھوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

کے ماہرین کی ہے اس وجہ سے میں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی معلوم ہے کہ شانِ نزول سے متعلق روایات بیشتر ضعیف بلکہ بے بنیاد ہیں، اس وجہ سے ان کو عقل و نقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مان لینے سے اسی فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے جس سے آیت زیر بحث میں اہلِ ایمان کو روکا گیا ہے۔

اس شانِ نزول کو درایت کی کسوٹی پر جانچیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت میں فاسق کی روایت پر اعتماد کرنے سے روکا گیا ہے جب کہ ولیدؓ کے متعلق اس واقعے سے پہلے کوئی بات بھی ایسی لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی جس سے معلوم ہو سکتا کہ نعوذ باللہ وہ فاسق ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ان کے فسق کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی بلکہ ان کی ثقاہت و عدالت کا یہ مرتبہ تھا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحصیل زکوٰۃ کے ذمہ دارانہ منصب پر مامور فرمایا۔ اگر ان کے اندر اس قسم کا کوئی کھوٹ ہوتا تو حضورؐ ان کو اس اہم خدمت کے لیے کس طرح منتخب فرماتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شانِ نزول کو باور کر لیجیے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ سے اتنے ناواقف تھے کہ ایسے لوگوں کو ذمہ دارانہ مناصب پر مامور فرما دیتے تھے جو اپنی دروغ بافی سے حکومت اور رعایا دونوں کو خطرے میں ڈال دیں۔ اس قسم کی بے بصیرتی ایک عام معقول آدمی سے بھی بعید از قیاس ہے چہ جائیکہ اس کا صدور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر ولیدؓ استقبال کرنے والی پارٹی کو جنگجو پارٹی سمجھ کر اس سے ڈر کے واپس آ گئے تھے اور اپنا تاثر انھوں نے حضورؐ کے سامنے یہ بیان کیا کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے تو ان کی یہ بات سادہ لوحی اور کمزوری تو قرار دی جا سکتی ہے لیکن از روئے شریعت اس کو فسق نہیں کہا جا سکتا۔ پھر تو اس مضمون کی آیت اترنی تھی کہ مسلمانو تم اپنے ذمہ دارانہ عہدے ایسے سادہ لوحوں کے سپرد نہ کیا کرو جو استقبال کرنے والوں اور لڑنے والوں کے درمیان امتیاز کرنے سے بھی قاصر ہوں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ولیدؓ اتنے سادہ لوح ہوتے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایسی اہم مالی اور سیاسی ذمہ داری سپرد کر دیتے؟ کیا کسی شخص کے اندر سادہ لوحی کوئی ناگہانی طور پر پیدا ہو جانے والی چیز ہے جو لوگوں سے مخفی رہے، یہاں تک کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اندازہ نہ ہو سکے!

چوتھی بات یہ ہے کہ یہی ولیدؓ ہیں جن کو سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دورِ خلافت میں کوفہ کا گورنر

بنایا۔ غور کیجیے کہ کیا حضرت عثمان غنیؓ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ یہ شخص از روئے نصِ قرآن فاسق قرار پا چکا ہے اور گورنری تو درکنار اسلامی قانون کی رو سے یہ کسی روایت یا شہادت کا بھی اہل نہیں ہے؟ اگر ناواقف تھے تو یہ مانیے کہ حضرت عثمانؓ جیسے خلیفۂ راشد، جن کو جامعِ قرآن ہونے کا بھی شرف حاصل ہے، نعوذ باللہ، قرآن کا اتنا علم بھی نہیں رکھتے تھے جتنا علم شانِ نزول کی روایتیں کرنے والے ان راویوں کو تھا۔

میں نے اس شانِ نزول کے صرف چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، ورنہ اضطراب اس کے ہر پہلو میں ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تادیبی دستہ روانہ کر دیا تھا، بعض میں ہے کہ روانہ کرنے کا فیصلہ فرما لیا تھا اور بنی مصطلق کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر تم لوگ اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمھاری سرکوبی کے لیے ایسے شخص کو بھیجوں گا جو عندی کنفسی (جو میرے نزدیک میری اپنی ذات کی طرح ہے) ساتھ ہی حضرت علیؓ کے شانے پر تھپتھپاتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی کہ اس مہم کو یہ سر کریں گے۔ بعض روایات میں اس کے برخلاف یہ ہے کہ اس مہم پر آپ نے حضرت خالدؓ کو بھیجا۔ غرض جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں، حالانکہ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کی کوئی بات آئی بھی تو آپ نے ٹال دی اور لوگوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ وہ پیغمبرؐ کو اپنی رایوں سے متاثر کرنے کی کوشش نہ کریں۔

میرے نزدیک یہ شانِ نزول روافض کی ایجادات میں سے ہے جس سے انھوں نے صرف ولیدؓ ہی کو بدنام کرنا نہیں چاہا ہے بلکہ حضرت عثمانؓ[1] کو بھی مطعون کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے یہ جانتے بوجھتے کہ یہ شخص فاسق ہے محض از راہِ کنبہ پروری اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ پھر کوفہ کی گورنری کے دوران میں بھی ان ظالموں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ ان کے فسق کے ایسے واقعات کی روایت کی ہے جن کو سن کر ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ ہنسی ان ظالموں کی ذہانت پر آتی ہے اور رونا اپنے مفسرین کی سادگی پر کہ اس قسم کی بے سروپا روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں حالانکہ آیت کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے ان کو کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۹)

---

[1] یہ امر واضح رہے کہ حضرت ولیدؓ سیدنا عثمان غنیؓ کے رشتہ دار بھی تھے۔

اگر مسلمانوں کے دو گروہ باہم تصادم ہو جائیں تو دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری

اوپر کی آیت میں اس بات کی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ کسی فاسق کی روایت پر اعتماد کر کے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کے خلاف کوئی اقدام کر بیٹھیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان اصلاحِ احوال کی کوشش کرو۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک پارٹی مصالحت پر آمادہ نہ ہو یا مصالحت کے بعد مصالحت کے شرائط کے خلاف دوسری پارٹی پر تعدی کرے تو اس صورت میں دوسرے مسلمانوں یا ان کی حکومت کو تعدی کرنے والی پارٹی سے جنگ کرنی چاہیے یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

'تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ' سے مراد اس فیصلہ کے آگے جھکنا ہے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ اگر کوئی پارٹی اس مصالحت سے گریز اختیار کر رہی ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھکنے سے گریز اختیار کر رہی ہے۔ اس لیے کہ اس صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسی بات کا حکم دیا ہے اور جب اللہ نے اس کا حکم دیا ہے تو اس کی حیثیت 'اَمْرُ اللّٰہِ' کی ہے۔

'فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا'۔ یعنی مسلمانوں کے اس اجتماعی ایکشن کے بعد اگر وہ فیصلہ کے آگے سر جھکا دے تو اس بنیاد پر اس کے خلاف کوئی مزید کارروائی نہیں کی جائے گی کہ اس نے سرکشی کی روش اختیار کی، بلکہ فریقین کے درمیان انصاف کے تقاضوں کے مطابق صلح کرا دی جائے گی جس فریق کا نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ٹھیک ٹھیک کرا دی جائے گی۔

لفظ 'اَقْسِطُوْا' اسی عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ کسی کے ساتھ بے جا رعایت کی جائے نہ کسی کو انصاف کے خلاف دبایا جائے بلکہ بے رُو رعایت جو کچھ عدل کا تقاضا ہے وہ پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

چند اجتماعی اصول جو آیت سے نکلتے ہیں

اس آیت سے مندرجہ ذیل اجتماعی اصول نکلتے ہیں۔

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمان اس کو برا یا جھگڑا سمجھ کر نہ تو اس سے بالکل الگ تھلگ رہیں اور نہ ان کے لیے یہ جائز ہے کہ بغیر اس بات کی تحقیق کیے کہ کون حق پر ہے کون ناحق پر، محض خاندانی، قبائلی اور گروہی عصبیت کے جوش میں کسی کے ساتھی اور کسی کے مخالف بن جائیں بلکہ انھیں ساری صورتِ معاملہ سمجھ کر فریقین کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ایک فریق مصالحت پر راضی نہ ہو بلکہ جنگ ہی پر ضد کرے یا مصالحت کے لیے من مانے طور پر ایسی شرطیں پیش کرے جو عدل کے منافی ہوں تو اس صورت میں مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس کے خلاف طاقت استعمال کر کے اس کو مصالحت کے شرائط کے آگے جھکنے پر مجبور کریں۔

اس طرح کی نزاعات میں غیر جانبدار مسلمان اللہ و رسول کی ہدایات اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کے مصالحت کے لیے جو شرطیں طے کریں گے فریقین پر ان کی اطاعت اسی طرح لازمی ہوگی جس طرح شریعت کے احکام کی اطاعت لازمی ہے، یہاں تک کہ جو فریق اس سے انحراف اختیار کرے گا اس سے جنگ کی جائے گی۔

مصالحت ہو جانے کے بعد اس کی شرائط کے خلاف اگر کوئی فریق دوسرے فریق پر تعدی کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا قرار پائے گا۔ مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ اس کی سرکوبی کریں۔

موجودہ زمانے کی ایک شکل

یہ امر واضح رہے کہ یہ ہدایات اس صورتِ حال کے لیے دی گئی ہیں جب نزاع مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان واقع ہو اور ان کی ایک مرکزی طاقت فریقین کے درمیان مداخلت کرنے کے پوزیشن میں ہو۔ اس زمانے میں یہ پیچیدہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سی چھوٹی بڑی مسلمان حکومتیں الگ الگ قائم ہو گئی ہیں۔ ان کے درمیان اگر خدانخواستہ کوئی جنگ چھڑ جائے تو دوسری مسلمان حکومتوں کے لیے اس قضیہ سے بالکل الگ تھلگ رہنا تو جائز نہیں ہے، مصالحت کی کوشش، جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے، ہر ایک کو کرنی ہوگی البتہ عملاً مداخلت کا معاملہ صورتِ حال پر منحصر ہے۔ جس کا تعلق وقت کے سیاسی تقاضوں سے ہے۔ اگر صورتِ حال اجازت دے گی تو تعدی کرنے والے فریق کو حق کے آگے جھکانے کے لیے اس کے خلاف طاقت استعمال کرنا بالکل جائز ہوگا اور اگر اس سے مزید بین الملّی یا بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو عملی مداخلت سے تو گریز اختیار کیا جائے گا لیکن مصالحت کی جدوجہد سے گریز کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۱۰)

یعنی مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان کے درمیان کسی نزاع کا برپا ہونا ہی اول تو ان کی باہمی اخوت کے منافی ہے لیکن شیطان کی انگیخت سے کوئی نزاع برپا ہو ہی جائے تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے درمیان مصالحت کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ اس آگ کو مزید بھڑکانے کی۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اگر تمہارے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوا جو بھائیوں اور بھائیوں کے درمیان قتل و خون کا سبب ہوا یا تم محض قومی، قبائلی، علاقائی یا سیاسی

مصلحتوں کی خاطر کسی پہلو سے اس خون خرابے میں حصہ لینے والے بنے تو یاد رکھو کہ اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکو گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے جو اس کی قائم کی ہوئی اس اخوت کو ہمیشہ استوار و پائدار رکھنے کی کوشش کریں گے، نہ خود اس میں کوئی رخنہ پیدا کریں گے نہ اپنے امکان کے حد تک کسی کو اس میں کوئی رخنہ پیدا کرنے کا موقع دیں گے۔

بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ میں مثنیٰ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جنگ دو بھائیوں ہی کے درمیان ہو، بلکہ یہ مثنیٰ مسلمانوں کے دو گروہوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثنیٰ کا اس طرح استعمال عربی میں معروف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

۲- قرآن میں جرح و تعدیل کا ماخذ

ہمارے محدثین اور فنِ رجال کے ائمہ نے سورۂ حجرات کی اسی آیت ——— اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا ——— کو ماخذ قرار دیا ہے راویوں پر جرح و تنقید کے حکم کا جس کی بدولت اسماء الرجال کا عظیم الشان فن وجود میں آیا جو ان علوم میں سے ایک ہے جن کے بانی ہونے کا شرف دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں کو حاصل ہوا۔

آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جب کوئی فاسق کسی اہم واقعے کی خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ یہ حکم یوں تو عام ہے، ہر ایسی خبر کی تحقیق ضروری ہے جو دُور رس نتائج کی حامل ہو لیکن کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے کوئی روایت کرے تو اس کی تحقیق و تنقید بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور واجب الاطاعت ہادی ہیں۔ آپ کی ہر بات بلکہ ہر ادا امت کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے منسوب کر کے کوئی غلط روایت کر دی جائے اور وہ تحقیق کے بغیر قبول کر لی جائے تو یہ چیز دنیا میں بھی موجبِ خسران بن سکتی ہے اور آخرت میں بھی۔

آیت میں اگرچہ فاسق ہی کی روایت کی تحقیق کا حکم ہے لیکن اس سے آپ سے آپ یہ بات بھی نکلی کہ اگر کوئی راوی مجہول ہو، نہ اس کا فسق معلوم ہو نہ اس کی ثقاہت، تو اس کی تحقیق بھی ضروری ہوگی، کیونکہ ایک مجہول راوی کی روایت قبول کر لینے میں اندیشہ ہے کہ ممکن ہے راوی فاسق ہو۔ چنانچہ محدثین نے مجہول راویوں کی بھی اچھی طرح تحقیق کی تاکہ ان کا فسق یا ان کی عدالت واضح ہو جائے۔ اگر کسی راوی کی تحقیق میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی تو اس کو مجہول قرار دے کر اس کی روایت انھوں نے رد کر دی۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ تحقیق اسی صورت میں ضروری ہوگی جب فاسق کوئی ایسی روایت کرے جو دُور رس نتائج کی حامل ہو، اس لیے کہ یہاں لفظ 'نَبَأ' وارد ہوا ہے جو کسی اہم اور دُور رس نتائج کی حامل خبر ہی کے لیے آتا ہے۔ عام خبر یا واقعہ کے لیے یہ لفظ نہیں آتا۔ چنانچہ روزمرہ زندگی کے عام معاملات میں فاسق یا کافر کی خبر مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آیت میں راوی اور روایت دونوں کی تحقیق کا حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ فرمایا گیا ہے کہ 'اے ایمان والو، اگر تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو'۔ ظاہر ہے کہ یہاں 'تَبَیَّنُوا' کا مفعول راوی بھی ہے اور روایت بھی بلکہ روایت کا مفعول ہونا زیادہ واضح ہے اس لیے کہ راوی کا فسق تو یہاں معلوم ہی ہے۔ کسی روایت کی تحقیق میں جس طرح راوی کی ثقاہت، عدالت اور فقاہت اہمیت رکھتی ہے اسی طرح خود روایت کے الفاظ، اس کا موقع و محل، دوسری روایاتِ باب کے ساتھ اس کی مخالفت یا موافقت، عقل و نقل کی کسوٹی پر اس کا مرتبہ اور سب سے زیادہ خدا کی کتاب کے ساتھ اس کی ہم آہنگی اور اس قبیل کی دوسری چیزیں بھی اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر صرف راوی کی تحقیق پر کفایت کر کے یہ چیزیں نظر انداز کر دی جائیں تو تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارے محدثین زیادہ زور صرف راوی کی تحقیق پر صرف کرتے ہیں، نفسِ متن پر ان پہلوؤں سے غور کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ حالانکہ ان پہلوؤں سے تحقیق کیے بغیر تحقیق کا حق، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ہرگز ادا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء نے متنِ حدیث پر غور کرنے کے لیے اصول وضع کیے اور اس کا نام درایت رکھا۔ اس خدمتِ خاص میں سب سے بڑا حصہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ یہ خدمت انجام دے کر انھوں نے صرف فقہ ہی پر احسان نہیں کیا ہے، بلکہ فنِ حدیث کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، اگر ہمارے علماء ان اصولوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی توفیق پاتے تو حدیث کے خلاف وہ فتنہ ہرگز نہ اٹھ سکتا جو فتنہ پردازوں نے اٹھا دیا اور جس نے گمراہ فرقوں کے لیے دین میں دراندازی کی بہت سی راہیں کھول دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے 'تدبرِ حدیث' پر اپنی پیشِ نظر کتاب لکھنے کی توفیق اور مہلت بخشی تو اس کے مقدمہ میں ان شاء اللہ ان اصولوں کی قدر و قیمت میں واضح کروں گا۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے محدثین کرام نے فاسق اور مجہول راویوں کی جو پردہ دری کی ہے وہ قرآن کے اسی واضح اور قطعی حکم کی تعمیل میں کی ہے لیکن اس زمانے میں بعض خوش فہم حضرات نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ راویوں کے عیوب کھولنا ہے تو غیبت جس کو قرآن نے اسی سورہ کی آیت ۱۲ میں حرام قرار دیا اور اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے

تعبیر فرمایا ہے لیکن محدثین نے 'حکمتِ عملی' کے تحت اس حرام کو جائز بنایا تاکہ فاسق راویوں کی روایات سے دین کو بچائیں۔ پھر اس نکتہ سے ان حضرات نے ایک اور اس سے بھی زیادہ عمیق و دقیق نکتہ پیدا کر لیا کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں اس وجہ سے ایک 'قائد تحریک اسلامی' کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ 'حکمتِ عملی' کے تقاضوں کے تحت جب ضرورت محسوس کرے کسی حرمت کو حلت سے بدل دیا کرے۔ اِن نکات پر اپنے ناچیز خیالات ہم اپنے مقالات میں ظاہر کر چکے ہیں۔ یہاں ان پر تنقید کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ جب قرآن نے فاسق اور مجہول راویوں کی پردہ دری اور ان کی روایات کی تحقیق کا حکم خود اس صراحت کے ساتھ دیا ہے تو محدثین اس خدمت کے لیے غیبت جیسی ناپاک چیز کو 'حکمتِ عملی' کے تحت جائز بنانے کی زحمت کیوں اٹھاتے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ راویوں پر جرح کو غیبت قرار دینے کا سہرا ہمارے ارباب تصوف کے سر ہے۔ تصوّف کی ساری عمارت، چونکہ ضعیف اور بے بنیاد روایات ہی پر قائم ہے، اس وجہ سے جب محدثین نے راویوں کی چھان بین کا کام شروع کیا تو ان حضرات کو محسوس ہوا کہ اگر محدثین اسی بے خوفی کے ساتھ یہ کام کرتے رہے تو تصوّف کی پوری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ اس خطرے سے تصوّف کو بچانے کے لیے ان حضرات نے یہ نکتہ نکالا کہ یہ محدث حضرات تو لوگوں کی غیبت کرتے پھرتے ہیں۔ صوفیوں کا یہ نکتہ ان کے اپنے حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان کے اسی نکتہ کو ہمارے اس دور کے بعض ذہنوں نے اپنی 'حکمتِ عملی' کے لیے اپنا لیا اور اس کے بل پر ایک ایسا اصول وضع کر دیا جو سارے دین ہی کا تیا پانچا کر کے رکھ دے۔

آخر میں اس آیت سے متعلق ایک بات اور یاد رکھیے۔ بعض محدثین اور فقہاء فاسق کی روایت قبول کرنے کے باب میں اس کے فسقِ عملی کو تو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے عقائدی فسق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی شخص اگر کسی عملی فسق مثلاً جھوٹ اور بدکرداری وغیرہ میں مبتلا ہو تو اس کی روایت یا شہادت تو بے شک قبول نہیں کی جائے گی، لیکن اگر وہ صرف کسی فاسقانہ عقیدہ میں مبتلا ہے تو مجرد اس کے فسادِ عقیدہ کی بنا پر اس کی روایت یا شہادت رد نہیں کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک یہ رائے بالکل غلط ہے۔ تجربہ گواہ ہے کہ جتنی جھوٹی روایتیں فسادِ عقیدہ میں مبتلا راویوں نے گھڑی ہیں اتنی فسادِ عمل میں مبتلا راویوں نے نہیں گھڑی ہیں۔ یہ انہی کی گھڑی ہوئی روایتیں ہیں جو سیرت، تفسیر، تصوّف اور تاریخ کی کتابوں میں بھری ہوئی ہیں اور جن سے اہلِ بدعت وضلالت نے اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان علماء پر رحم فرمائے جنھوں نے فاسد العقیدہ راویوں کو یہ چھوٹ دے کر ملت کو ایک ایسے فتنہ سے دوچار کر دیا جس

سے اہلِ حق کے لیے عہدہ برآ ہونا نہایت دشوار کام ہوگیا ہے۔

ہمارے نزدیک فسقِ عملی و فسقِ عقائدی کی یہ تقسیم بے معنی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اوپر جو کلیہ عام فاسقوں کے بارے میں بیان ہوا ہے وہی فاسد العقیدہ راویوں کے بارے میں بھی عقل و نقل کے موافق ہے یعنی ان کی روایت اور شہادت ان امور میں تو قبول کی جائے گی جن میں ایک کافر کی روایت بھی قبول کی جا سکتی ہے، لیکن اہم امور بالخصوص معاملاتِ دین میں ان کی روایت یا شہادت قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ آگے آیات ۱۱—۱۳ کا مضمون

اوپر آیت ۷ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اہتمامِ خاص کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے مسلمانوں کو کفر و فسق اور عصیان سے بچانے کے لیے خاص اپنے فضل سے فرمایا۔ اب آگے بعض ان باتوں سے روکا گیا ہے جو ایمان کے منافی اور داخلِ فسق ہیں اور جن سے دلوں کے اندر اس فساد کی تخم ریزی ہوتی ہے جو پورے معاشرے کو مسموم کر کے رکھ دیتا ہے اور جس کا سدِّ باب نہ ہو تو جن کو اللہ تعالیٰ نے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کے وصف سے ممتاز فرمایا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۱۳ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟
خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا
مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ
ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ
هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿١١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ
ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا۟ وَلَا يَغْتَب
بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ
مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ
إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۱۳﴾

ترجمۂ آیات ۱۱-۱۳

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق اڑائے، ممکن ہے وہ ان سے بہتر ٹھہریں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، کیا عجب وہ ان سے بہتر نکلیں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے پر برے القاب چسپاں کرو۔ ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے! اور جو لوگ توبہ نہ کریں گے تو وہی لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ۱۱

اے ایمان لانے والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے! سو اس چیز کو تو تم نے ناگوار جانا! اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا، مہربان ہے۔ ۱۲

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہمدگر تعارف حاصل کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ اشرف وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ بڑا ہی علیم و خبیر ہے۔ ۱۳

۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا
مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۱)

منافیٔ ایمان باتوں سے اجتناب کی تاکید

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کا خطاب یہاں صرف خطاب ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ آگے وہ برائیاں بیان ہو رہی ہیں جو داخلِ فسق اور منافیٔ ایمان ہیں۔ اس خطاب سے اہلِ ایمان کو گویا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان سے مشرف ہو چکے ہیں ان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ ایمان کے بعد فسق کے داغ دھبوں سے اپنے دامن کو آلودہ کریں۔

فرمایا کہ ایمان میں داخل ہو جانے کے بعد نہ مردوں کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ دوسرے مردوں کو حقیر خیال کر کے ان کا مذاق اڑائیں نہ عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسری عورتوں کو تمسخر کا نشانہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و عمل پر ہے اور ایمان و عمل کا صحیح وزن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی میزانِ عدل سے معلوم ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو لیکن قیامت کے دن کھلے کہ خدا کی میزان میں اس کا وزن پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسی طرح امکان اس کا بھی ہے کہ جس کو اہلِ دنیا نے کبھی اپنی آنکھوں میں جگہ نہیں دی قیامت کے دن پتہ چلے کہ خدا کی بادشاہی میں جو مقام اس کا ہے وہ ان لوگوں کا نہیں ہے جنھوں نے اس کو حقیر جانا۔

یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر بھی خاص اہتمام سے ہوا ہے حالانکہ بظاہر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ 'لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ' کے عام الفاظ ان کے لیے بھی کافی تھے۔ لیکن قرآن نے فضائل و رذائل دونوں کے بیان میں یہ اسلوب ملحوظ رکھا ہے کہ عورتوں کا ذکر ان مواقع میں خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے جہاں تاکید کے ساتھ ان کو کسی فضیلت کے لیے ابھارنا یا کسی فتنہ سے بچانا مقصود ہے۔ یہاں بھی دوسری صورت ہے۔ جس برائی سے یہاں مردوں کو روکا گیا ہے وہ عورتوں کے اندر اس سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں پائی جاتی جتنی مردوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ جن عورتوں کے اندر اپنی خاندانی، نسبی اور مالی برتری یا اپنے ظاہری حسن و جمال کا غرور ہوتا ہے ان کا اندازِ خطاب و کلام ان عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقابل میں فروتر خیال کرتی ہیں۔

یہاں جن باتوں سے روکا گیا ہے ان کا ایک خاص باطن ہے اور مقصود در حقیقت، اسی کی بیخ کنی ہے۔ پیرے کی آخری آیت میں اس باطن کی طرف اشارہ ہے۔ شیطان نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے جو فتنے ایجاد کیے ہیں ان میں ایک بہت بڑا فتنہ نسل و نسب، خاندان، برادری، کنبہ اور قبیلہ کے شرف و امتیاز کا فتنہ بھی ہے۔ جو لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں (اور بہت کم ایسے خوش قسمت نکلتے ہیں جو اپنے کو اس فتنہ سے محفوظ رکھ سکیں) ظاہر ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے مقابل میں حقیر خیال کرتے ہیں اور جب حقیر خیال کرتے ہیں تو لازماً ان کے قول، فعل اور رویہ سے اس کا اظہار بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ چیزیں پختہ ہو کر ان کے ہاں روایت کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں بلکہ ان کا بس چلتا ہے تو وہ ان کو مذہب کا درجہ بھی دے دیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوؤں میں برہمنوں نے، یہود میں بنی لاوی نے اور عربوں میں قریش نے اسی طرح تقدس کا ایک ایسا مقام اپنے لیے پیدا کر لیا جس کو چیلنج کرنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں رہ گیا۔ یہی حال ہر قوم کا ہوا ہے اور مساواتِ انسانی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود آج بھی یہی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان جو اس فتنہ کی بیخ کنی کے لیے برپا کیے گئے تھے وہ بھی آج نہ جانے کتنی برادریوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہیں اور ہر ایک 'ہمچو من دیگرے نیست' کے نشہ سے سرشار رہے جس کا اظہار ہر قوم و قبیلہ کے عوام و خواص کے بیانات اور نعروں سے ہوتا رہتا ہے جس سے فطری طور پر دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے جو عداوت و بغضاء کی شکل اختیار کر کے بالآخر خون خرابے اور تقسیم و تفریق تک نوبت پہنچا دیتی ہے۔

یہاں قرآن نے مسلمانوں کو اسی آفت سے محفوظ رہنے کی ہدایت فرمائی کہ تم کو اللہ نے اپنے فضل سے جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی بخشی ہے۔ تمہارا معاشرہ 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ' کی اساس پر قائم ہے اور تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے 'رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ' بنائے گئے ہو تو اپنے دوسرے بھائیوں کو حقیر سمجھ کر یا ان کو اپنے طنزیہ اور حقارت آمیز الفاظ کا ہدف بنا کر اس معاشرہ کا حلیہ مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو۔

'عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ' یہ اس اصل حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس بات میں صحیح رہنمائی دینے والی ہے کہ عزت و شرف کی بنیاد نسل، نسب، خاندان، برادری، قوم، قبیلہ اور مال و دولت پر نہیں بلکہ آدمی کے دین و تقویٰ پر ہے اور اس بات کا فیصلہ کل کو قیامت کے دن ہوگا کہ کس کا تقویٰ زیادہ ہے اور وہ اللہ کے نزدیک اشرف و اعلیٰ ہے اور کون اپنے تمام ادعائے حسب و نسب اور غرور عز و شرف کے باوجود خدا کے نزدیک بالکل بے وزن اور بے حقیقت ہے۔

طنز اور پھبتی کی ممانعت

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ 'لمز' کے معنی کسی پر طعن کرنا، آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے اس پر کوئی طنز آمیز فقرہ چست کر دینا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ آیت ۷۹، میں منافقین کے بارے میں فرمایا ہے کہ وَالَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی جب غریب مسلمان اپنی گاڑھی کمائی میں سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو منافقین ان کی حوصلہ شکنی کے لیے ان پر بانداز استخفاف طنزیہ فقرے چست کرتے ہیں کہ لو، آج حاتم کی قبر پر لات مارنے یہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس قسم کے زہر آلود فقرے قائل کے حسد کی بھی غمازی کرتے ہیں اور اس کے کبر و غرور کی بھی، اور ان کا اثر دوسروں پر یا تو حوصلہ شکنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یا نفرت و عناد کی صورت میں اور یہ دونوں ہی چیزیں معاشرے کے اندر زہر پھیلانے والی ہیں۔

'اَنْفُسَكُمْ' یہاں اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح النسآء کی آیت ۲۹ میں لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنے آپ کو قتل نہ کرو) آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان پر طعن کرتا ہے وہ گویا اپنے ہی اوپر طعن کرتا ہے اس لیے کہ تمام مسلمان آپس میں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کے اصول پر بھائی بھائی ہیں تو جس نے اپنے کسی بھائی کو اپنے کسی طعن و طنز کا ہدف بنایا اس نے گویا اپنے ہی سینہ کو اپنے تیر کا نشانہ بنایا اور اپنے ہی کو مجروح کیا۔

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ 'تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ' کے معنی آپس میں ایک دوسرے پر بُرے القاب چسپاں کرنا ہے۔ اچھے القاب سے ملقّب کرنا جس طرح کسی فرد یا قوم کی عزت افزائی ہے اسی طرح بُرے القاب کسی پر چسپاں کرنا اس کی انتہائی توہین و تذلیل ہے۔ ہجویہ القاب لوگوں کی زبانوں پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں اور ان کا اثر نہایت دُوررس اور نہایت پائدار ہوتا ہے۔ ان کی پیدا کی ہوئی تلخیاں پشت ہا پشت تک باقی رہتی ہیں اور اگر معاشرے میں یہ ذوق اتنا ترقی کر جائے کہ ہر گروہ کے شاعر، ادیب، ایڈیٹر اور لیڈر اپنی ذہانت اپنے حریفوں کے لیے بُرے القاب ایجاد کرنے میں لگا دیں تو پھر اس قوم کی خیر نہیں ہے۔ اس کی وحدت لازماً پارہ پارہ ہو کے رہتی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دورِ جاہلیت میں عربوں کے اندر یہ ذوق بدرجۂ کمال ترقی پر تھا۔ قبیلہ کا سب سے بڑا شاعر اور خطیب وہی مانا جاتا جو دوسروں کے مقابل میں اپنے قبیلہ کے مفاخر بیان کرنے اور حریفوں کی ہجو و تحقیر میں یکتا ہو۔ ان کے ہجویہ اشعار پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ اس فنِ شریف میں انھوں نے کتنا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کی اس چیز نے ان کو کبھی ایک قوم بننے نہیں دیا۔ وہ برابر اپنوں ہی کو گرانے اور پچھاڑنے میں لگے رہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسلام نے ان کو انسانی وحدت اور ایمانی ہم آہنگی سے آشنا کیا جس کی بدولت وہ دنیا کی ہدایت و قیادت کے اہل بنے۔ قرآن نے یہاں ان کو دورِ جاہلیت کے انہی فتنوں سے آگاہ کیا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایمان و اسلام کی برکات سے نوازا ہے تو اس کی قدر کرو، شیطان کے ورغلانے سے پھر انھی لاف زنیوں اور خاک بازیوں میں نہ مبتلا ہو جانا جن سے اللہ نے تمھیں بچایا ہے۔

'بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ'۔ 'بِئْسَ' اور 'نِعْمَ' کے اندر فی الجملہ مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کا ٹھیک معنی خیز ترجمہ یہ ہوگا کہ نہایت ہی برا لفظ ہے فسق ایمان کے بعد۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جس طرح کہیں 'الشریر کاسمہ' شریر کا تو لفظ بھی برا ہے پھر شریر کے برے ہونے کا کیا ٹھکانا ہے! ہماری زبان میں بھی کسی شے کی انتہائی برائی کے اظہار کے لیے یہ اسلوب موجود ہے۔ مثلاً کہتے ہیں 'بھائی، اس چیز کے تو نام سے بھی گھن آتی ہے'۔

'بَعْدَ الْاِیْمَانِ' کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اگر تم ایمان سے آشنا نہ ہوئے ہوتے اور تم سے کوئی بات فسق کے قسم کی صادر ہو جاتی تو یہ چیز زیادہ تعجب انگیز نہ ہوتی لیکن جب تمھیں اللہ نے ایمان کی حلاوت سے آشنا کر دیا، جیسا کہ فرمایا ہے 'وَکَرَّهَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ' تو اب تو تمھیں 'فسق' کے نام سے بھی گھن محسوس کرنی چاہیے چہ جائیکہ تم سے کسی عملِ فسق کا صدور ہو!

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے یہ سب فسق میں داخل ہیں اور اہلِ ایمان کی حسِ ایمانی اتنی بیدار ہونی چاہیے کہ ارتکابِ فسق تو درکنار لفظ فسق سے بھی وہ نفور و بیزار ہوں۔

'وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' یہ نہایت سخت الفاظ میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو اس وضاحت کے بعد بھی اس قسم کے کسی فسق کے مرتکب ہوں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ ان باتوں سے توبہ نہیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ ظالم وہی ٹھہریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے سامنے ایمان کی برکتیں بھی واضح کر دی ہیں اور ان کو کفر و فسق کے نتائج سے بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد بھی جو لوگ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے وہ اس کے نتائج سے لازماً دوچار ہوں گے اور یہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

بعض برائیاں جو بظاہر چھوٹی لیکن باطن کے اعتبار سے بڑی ہیں

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ط وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۱۲)

یہ اہلِ ایمان کو از سرِ نو خطاب کر کے بعض ایسی باتوں سے روکا گیا ہے جو بظاہر تو معمولی نظر

آتی ہیں لیکن یہ انسان کے خود اپنے دل کو ایسے روگ میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ تقویٰ کی روئیدگی کے لیے بالکل ناسازگار ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جن کو ایمان عزیز ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان آفتوں سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔

بدگمانی

پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ انسان اپنے دل کو دوسروں سے متعلق بدگمانیوں کی پرورش گاہ نہ بنائے کہ جس کی نسبت جو برا گمان بھی دل میں پیدا ہو جائے اس کو کسی گوشے میں محفوظ کرے۔ انسان کو جن سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے ان کی بابت کوئی اچھا یا برا گمان دل میں پیدا ہونا ایک امر فطری ہے۔ یہی گمان آدمی کو آدمی سے جوڑتا یا توڑتا ہے۔ اس پہلو سے معاشرے میں یہ وصل و فصل کی بنیاد ہے۔ اس کی اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی اس کے رد و قبول کے معاملے میں بھی بے پروا و سہل انگار نہ ہو بلکہ نہایت ہوشیار اور بیدار مغز رہے۔ اہل ایمان کو اسلام نے اس باب میں یہ رہنمائی دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھے اِلّا آنکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اس نیک گمان کا سزاوار نہیں ہے۔ یہ نیک گمانی اس ایمانی اخوت کا لازمی تقاضا ہے جس پر اسلام نے معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

اگر کوئی شخص اس کے برعکس یہ اصول ٹھیرا لے کہ جو رطب و یابس گمان اس کے دل میں پیدا ہوتے جائیں ان سب کو سینت کے رکھتا جائے تو گمانوں کے ایسے شوقین کی مثال اس شکاری کی ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے شوق میں ایسا اندھا ہو جائے کہ مچھلیاں پکڑتے پکڑتے سانپ بھی پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ مچھلیوں کے شوق میں جو شخص ایسا اندھا بن جائے گا اندیشہ ہے کہ اسی شوق میں کسی دن وہ اپنی زندگی ہی گنوا بیٹھے گا۔ قرآن نے یہاں اسی خطرے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ گمانوں کے زیادہ درپے نہ ہو کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے یہ تعلیم نکلی کہ ایک مومن کو بدگمانیوں کا مریض نہیں بن جانا چاہیے بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں سے حسن ظن رکھنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو حتی الامکان اس کی اچھی توجیہ کرے اگر کوئی اچھی توجیہ نکل سکتی ہو۔ اس کے برے پہلو کو اسی شکل میں اختیار کرنا جائز ہے جب اس کی کوئی اچھی توجیہ نہ نکل سکے۔ اگر بدگمانی کے سزاوار سے آدمی کو خوش گمانی ہو تو یہ اس بات کے مقابل میں اہون ہے کہ وہ کسی خوش گمانی کے حقدار سے بدگمانی رکھے۔ حدیث شریف میں مومن کی تعریف یہ آئی ہے کہ اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ (مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے)۔

اس زمانہ میں لوگوں کا عام پسندیدہ اصول یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھو اِلّا آنکہ وہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے گوں کا آدمی ہے۔ اس چیز کو لوگ سیاست اور زیرکی خیال کرتے ہیں۔ دشمن کے مقابل میں تو یہ زیرکی و ہوشیاری ضروری ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کے تحت ہم اس کی وضاحت کر چکے

ہیں لیکن اہلِ ایمان کے مقابل میں یہ سیاست کس طرح صحیح ہو سکتی ہے جب کہ ان کو اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اور رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہونے کی قرآن نے ہدایت فرمائی ہے؟۔

تجسس دوسری بات آیت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا تَجَسَّسُوْا (ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو)۔ جس طرح اوپر والے ٹکڑے میں اچھے گمان سے نہیں بلکہ بُرے گمان سے روکا گیا ہے اسی طرح یہاں ممانعت اس ٹوہ میں لگنے کی ہے جو بُرے مقصد سے ہو۔ یعنی تلاش اس بات کی ہو کہ دوسرے کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی بات ہاتھ آئے جس سے اس کی خامیوں سے آگاہی اور اس کے اندرونِ خانہ کے اسرار تک رسائی ہو۔ یہ چیز کبھی تو حسد کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے کہ حریف کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو سامنے آئے جس سے کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ کبھی بغض و عناد کی شدت اس کا باعث ہوتی ہے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ لگے جس کی عندالضرورت تشہیر کرکے مخالف کو رُسوا کیا جا سکے۔ اس زمانے میں اس نے ایک پیشہ کی شکل بھی اختیار کرلی ہے جس کو جدید اخبار نویسی نے بہت ترقی دی ہے۔ بعض اخبار نویس رات دن کسی نہ کسی اسکینڈل کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ شاطر وہ اخبار نویس سمجھا جاتا ہے جو کسی نمایاں شخصیت کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق کوئی ایسا اسکینڈل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے جس سے اس کا اخبار یا رسالہ ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اس طرح کا تجسس ظاہر ہے کہ اس اخوت اور باہمی ہمدردی کے بالکل منافی ہے جو اسلامی معاشرہ کی اساس ہے، اس وجہ سے اہلِ ایمان کو اس سے روکا گیا ہے۔ رہا وہ تجسس جو ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے حالات کا اس مقصد سے کرتا ہے کہ اس کی مشکلات و ضروریات میں اس کا ہاتھ بٹا سکے یا ایک اسلامی حکومت اس غرض سے کرتی ہے کہ رعایا کے حالات سے پوری طرح باخبر رہے تو یہ تجسس نہ یہاں زیرِ بحث ہے اور نہ یہ ممنوع ہے بلکہ ہر شریف پڑوسی کے لیے یہ نہایت نیکی کا کام ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے حالات و مسائل سے آگاہ رہے تاکہ ان کی مشکلات میں ان کی مدد کر سکے اور حکومت کے لیے تو یہ صرف نیکی ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ رعایا کے اچھے اور بُرے دونوں طرح کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنے کا اہتمام رکھے تاکہ اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔

غیبت تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے) غیبت کے معنی کسی کی اس کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنے کے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کے مفہوم ہی میں یہ بات داخل ہے کہ غیبت کرنے والا چاہتا ہے کہ اس کے اس فعل کی خبر اس کو نہ ہو جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے۔ اسی خواہش کی بنا پر وہ یہ کام اس کے پیٹھ پیچھے صرف ان لوگوں کے سامنے کرتا ہے جو یا تو اس کے ہم راز و ہم خیال اور شریکِ مقصد ہوتے ہیں یا کم از کم ان سے یہ

اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ہمدرد ہوں گے جس کی وہ برائی بیان کر رہا ہے اور اس کے سامنے یہ راز فاش کر دیں گے۔ غیبت کی یہی خصوصیت اس کو ایک نہایت مکروہ اور گھنونا فعل بناتی ہے اس لیے کہ اس سے نہ کسی حق کی حمیت و حمایت کا مقصد حاصل ہوتا نہ کسی اصلاح کی توقع ہو سکتی ہے بلکہ اس طرح ایک بزدل شخص کسی کے خلاف صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض خوش فہم کسی کی برائی کے ذکر کی ہر صورت کو غیبت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک محدثین کا راویوں پر جرح کرنا، کسی کے خلاف عدالت میں گواہی دینا، کسی کے منکر پر نکیر کرنا، کسی کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانا، کسی کے باب میں کسی مشورہ چاہنے والے کو اس کے کسی واقعی عیب سے آگاہ کرنا اور اس قبیل کی ساری ہی باتیں ہیں تو داخلِ غیبت، لیکن یہ غیبتیں حکمتِ عملی کے تحت جائز کر دی گئی ہیں۔ پھر وہ یہیں سے اپنے لیے ایک شرعی اصول یہ نکال لیتے ہیں کہ شریعت کی تمام حرمتیں ابدی نہیں ہیں اس وجہ سے انھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ان کی حکمتِ عملی کسی حرام کو مباح کرنے کی اگر مقتضی ہو تو وہ اس کو جائز قرار دے سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دین کے خلاف ایک نہایت شدید قسم کا فتنہ ہے جس سے بہت سے نئے فتنوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم نے اس کی تردید میں مستقل مضامین بھی لکھے ہیں اور یہاں بھی ہم آگے ایک مستقل فصل میں اس کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

'اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ'۔ یہ غیبت کے گھنونے پن کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے کسی بھائی کی، اس کے پیٹھ پیچھے، برائی بیان کرتا ہے وہ گویا اس حال میں اس کا گوشت کھا رہا ہے جب کہ وہ مردہ پڑا ہوا اور اپنی مدافعت سے بالکل قاصر ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز تو ایسی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اس کو پسند نہیں کرتا، تو جب تم اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو اسی طرح کی مکروہ چیز، غیبت کو کیوں گوارا کرو! 'مَیْتًا'، یہاں 'اَخِیْهِ' میں مضاف سے حال پڑا ہوا ہے اور یہ تصویر ہے اس کی اپنی مدافعت سے بےبسی کی۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ'۔ یہ تنبیہ بھی ہے اور توبہ و اصلاحِ حال کی ترغیب بھی۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو جو لوگ اس طرح اپنے بھائیوں کا گوشت مفت کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو اس کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ اس کے پیچھے اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھتے ہیں۔ اللہ نے تمھیں بروقت تنبیہ فرما دی ہے تاکہ توبہ اور اصلاح کر کے اپنے کو اس خطرہ سے محفوظ کر لو۔ اگر تم نے توبہ کر لی تو اللہ بڑا ہی توبہ قبول فرمانے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں (۱۱-۱۲) میں جن چھ باتوں سے روکا گیا ہے ان پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اوپر کی تین باتیں — مذاق اڑانا، طعن کرنا اور برے القاب چسپاں کرنا — ان برائیوں میں سے ہیں جن کا ارتکاب انسان علانیہ پبلک میں کرتا ہے۔ باقی تین برائیاں — سوء ظن، تجسس اور غیبت — انسان کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھنے والی ہیں جن کو وہ دوسروں سے چھپا کر یا اپنے محرمانِ راز کے اندر محدود رکھ کر کرتا ہے۔ ان دونوں ہی قسم کی برائیوں کی ممانعت اسلامی تزکیہ و تطہیر کے اس اصول پر مبنی ہے جو قرآن میں وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (الانعام: ۱۲۰) (اور گناہ کے ظاہر اور اس کے باطن دونوں ہی کو چھوڑ دو) کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ جب تک انسان اپنے آپ کو ان برائیوں سے پاک نہیں کرتا جو اس کے باطن سے تعلق رکھنے والی ہیں، اس وقت تک اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے علام الغیوب ہونے کا وہ شعور راسخ نہیں ہوتا جس کے بغیر دل کے اندر تقویٰ کی روئیدگی بالکل خارج از امکان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۱۳)

نسلی اور خاندانی غرور پر ضرب

ایک عام خطاب سے یہ اس نسلی، خاندانی اور قبائلی غرور کا یک قلم خاتمہ کر دیا جو ان برائیوں میں سے اکثر کا سبب بنتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ فرمایا کہ اے لوگو! اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھو کہ ہم نے سب کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے۔ یعنی تمام بنی نوعِ انسان کا آغاز آدمؑ اور حواؑ ہی سے ہوا ہے اس وجہ سے باعتبار خلقت کسی کو کسی پر کوئی شرف و تفوق حاصل نہیں ہے۔ خاندانوں اور قبائل کی تقسیم محض تعارف اور شناخت کے لیے ہے۔ کسی خاص خاندان یا قبیلہ کو اللہ تعالیٰ نے بجائے خود یہ امتیاز نہیں بخشا ہے کہ جو اس میں پیدا ہو وہ اللہ کے ہاں معزز بن جائے اور دوسروں کے مقابل میں وہ اپنے کو اشرف و اعلیٰ سمجھنے لگے۔ جس طرح اللہ نے لوگوں کی شکلوں، ان کے رنگوں اور ان کے قد و قامت میں فرق رکھا تاکہ لوگ ایک دوسرے کو شناخت کر سکیں اسی طرح خاندانوں اور قبیلوں کی حد بندیاں قائم کر دیں تاکہ لوگ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس سے زیادہ ان حد بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ کسی خاندان یا قبیلہ کے لوگ اس پندار میں مبتلا ہو جائیں کہ وہ اللہ کے نزدیک معزز ہیں، اس نے ان کو دوسروں پر کوئی برتری بخشی ہے۔ اللہ کے ہاں عزت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کی حدود کی سب سے بڑھ کر پابندی قائم رکھنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ یعنی اس مقرر کردہ معیار پر لوگوں کو پرکھنے میں اللہ تعالیٰ کو کوئی

زحمت یا کوئی مغالطہ پیش آنے کا امکان نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا اور ہر ایک کے ہر قول و فعل کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو عزت کا مستحق ہوگا وہ اپنا عزت کا مقام پا کے رہے گا، اگرچہ وہ کتنے ہی گمنام اور حقیر خاندان کے اندر سے اٹھا ہو اور جو اس کا مستحق نہیں ہوگا وہ خواہ کتنا ہی بڑا قرشی و ہاشمی یا سورج بنسی اور چاند بنسی ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس کو اسی کھڈ میں پھینکے گا جس کا وہ سزاوار ہوگا۔

۵۔ اس مجموعۂ آیات کی بعض ہدایات کی وضاحت

اس مجموعۂ آیات میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کی بقدر ضرورت وضاحت آیات کے تحت ہم کرتے آئے ہیں، لیکن تجسّس اور غیبت کے بعض پہلو مزید وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہاں ہم ان کو بھی صاف کر دینا چاہتے ہیں۔

کیا حکومت کے لیے بھی لوگوں کے حالات کا تجسس جائز نہیں ہے؟

اس زمانے میں چونکہ فرد کی آزادی کا تصوّر ذہنوں پر بہت غالب ہے اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے جس طرح عام افراد کو دوسروں کے احوال کے تجسّس سے روکا ہے اسی طرح حکومت کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے حالات کا تجسّس کرے۔ اس کو اپنا احتساب صرف ان معاملات تک محدود رکھنا چاہیے جو علانیہ طور پر اس کے نوٹس میں آجائیں۔ رہے اندرونِ خانہ کے معاملات تو وہ حکومت کے دائرۂ احتساب سے خارج ہیں۔ اس کی تائید میں بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے رات میں ایک شخص کے گانے کی آواز سنی جو اپنے گھر میں گا رہا تھا۔ آپ کو شک گزرا تو آپ دیوار پر چڑھ گئے۔ دیکھا کہ وہاں شراب بھی موجود ہے اور ایک عورت بھی۔ آپ نے پکار کر کہا اے دشمنِ خدا، کیا تو نے گمان کر رکھا ہے کہ تو اللہ کی نافرمانی کرے گا اور اللہ تیرا پردہ فاش نہ کرے گا؟ اس نے جواب دیا۔ امیرالمومنین، جلدی نہ کیجیے، اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے اکٹھے تین گناہ کر ڈالے ہیں۔ اللہ نے تجسّس سے منع کیا تھا اور آپ نے تجسّس کیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہو اور آپ دیوار چڑھ کر آئے۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ دوسروں کے گھروں میں اجازت کے بغیر نہ داخل ہو اور آپ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ اپنی غلطی مان گئے اور اس کے خلاف انھوں نے کوئی کارروائی نہ کی، البتہ یہ وعدہ لے لیا کہ وہ بھلائی کی راہ اختیار کرے گا۔

یہ روایت بعض حضرات نے مکارمِ اخلاق اور ترغیب و ترہیب کی نوعیت کی کتابوں میں درج کی ہے لیکن نہ سند کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ ہے اور نہ متن ہی کے پہلو سے یہ قابلِ اعتبار ہے۔ سند کے ضعف کے لیے تو یہی بات کافی ہے کہ بہت سے لوگ خاص طور پر اربابِ تصوف اخلاق و موعظت کی روایات میں تحقیقِ سند کی اہمیت کے قائل ہی نہیں ہیں۔ جس قسم کے قصوں سے ان کے

نزدیک کوئی مفید سبق حاصل ہوتا ہو ان کو بے تکلف بلا تحقیق سند و متن اپنی کتابوں میں درج کر دیتے ہیں۔ رہا اس کا متن تو اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ واقعہ بالکل ہی بعید از عقل و قیاس ہے۔

اول تو یہی بات ناقابلِ قیاس ہے کہ کوئی شخص مدینہ منورہ میں، اور وہ بھی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایسی جسارت کر سکے کہ شاہد و شراب کے ساتھ اس طرح رنگ رلیوں میں مصروف ہو کہ گانے کی آواز حضرت عمرؓ کو باہر گلیوں میں سنائی دے اور ان کو اس بزمِ عیش میں خلل انداز ہونا پڑے۔ اگر عین مرکزِ اسلام میں، فاروق اعظمؓ کے دور میں، شیطان کی جسارت کا یہ حال رہا ہے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ بھی شیطان کو مرعوب نہ کر سکے حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عمر (رضی اللہ عنہ) جس راستہ سے گزرتے ہیں شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو ماننا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ کو قرآن و حدیث کے یہ احکام معلوم نہیں تھے کہ کسی کے گھر میں اس کی دیوار پھاند کر داخل ہونا جائز نہیں ہے، بلکہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت لینی چاہیے۔ اگر اجازت ملے تو داخل ہونا چاہیے ورنہ تین بار سلام کر کے چپکے سے الٹے پاؤں واپس ہو جانا چاہیے۔ کیا کوئی شخص عقل و ہوش رکھتے ہوئے یہ باور کر سکتا ہے کہ کتاب و سنت کے ان صریح احکام سے حضرت عمرؓ کو پہلی بار ایک رند شاہد باز نے آگاہ کیا؟ کیا حضرت عمرؓ کو کبھی سورۂ نور اور سورۂ حجرات کی تلاوت کا، العیاذ باللہ، موقع نہیں ملا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے اپنی یہ تینوں غلطیاں نہایت سعادت مندی سے تسلیم کر لی تھیں تو اپنے عمّال اور گورنروں کو یہ ہدایت نامہ کیوں نہیں جاری فرمایا کہ اب تک میں غلطی پر تھا کہ لوگوں کے گھروں کا تجسس کیا کرتا تھا، اب مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس میں اکٹھی تین باتیں خلافِ شریعت ہیں اس وجہ سے تم لوگ اندرونِ خانہ کے معاملات سے تعلق نہ رکھو۔ لوگ اپنے گھروں میں جو اودھم چاہیں مچائیں، اگر تمھیں شبہ گزرے تو دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کر کے اجازت مانگو، اگر اجازت ملے تو گھر کے اندر جاؤ ورنہ تین بار سلام کر کے واپس لوٹ آؤ۔ جہاں تک ہمیں علم ہے حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا بلکہ متعدد واقعات تاریخوں میں ایسے موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ ان کے عمّال بھی تجسّس کرتے رہے اور خود حضرت عمرؓ بھی اس حد تک تجسّس کرتے تھے کہ راتوں میں دودھ پیتے بچے روتے، تو وہ ان کے رونے کا سبب معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس روایت کو باور کیجیے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک اسلامی حکومت میں اگر کچھ لوگ اپنے گھروں میں شرابیں پئیں، بازاری عورتوں سے رنگ رلیاں منائیں، رقص و سرود کی محفلیں گرم کریں یہاں تک کہ بم اور اسٹین گن کے ذخیرے بھی جمع کر چھوڑیں، تو بھی حکومت کی پولیس کو یہ حق

حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے گھروں میں گھس کر ان کے عیش کو مکدر کرے، یہاں تک کہ خلیفۂ وقت کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بدون اذن وہ ان کے گھروں میں داخل ہونے کی جرأت کر سکے اور کبھی غلطی سے اگر ایسی جرأت کر بیٹھے تو بس اتنی ہدایت فرما دیا کرے کہ آئندہ آپ لوگ اس طرح کی باتوں سے احتیاط کریں۔

یہ روایت اس قابل تو نہیں تھی کہ اس سے تعرض کیا جاتا لیکن اس کو اس زمانے میں ان لوگوں نے بڑے اعتماد سے پیش کیا ہے جو رات دن اسلامی حکومت کا وظیفہ پڑھتے ہیں، اس وجہ سے اس سے تعرض کرنا پڑا۔ بہر حال یہ روایت ہمارے نزدیک بالکل ناقابل اعتبار ہے۔ ایک اسلامی حکومت لوگوں کے اخلاق و کردار کی بھی محافظ ہوتی ہے اور ملک کے امن، عدل اور اس کی سلامتی کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جہاں کہیں اس کو کوئی شبہ گزرے وہ اس کا تجسّس کرے لیکن ہر حق کے استعمال پر کچھ اخلاقی و قانونی پابندیاں ہوتی ہیں جن کا لحاظ حکومت کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ حکومت اگر ان کا لحاظ نہیں کرتی تو خواہ اس کا ہاتھ کوئی نہ پکڑ سکے لیکن عنداللہ وہ لوگ مجرم ٹھہریں گے جنھوں نے ایک ایسے حق کو پبلک کے بے گناہ افراد کو پریشان کرنے کے لیے استعمال کیا جو ان کو امن، عدل اور رعایا کی حفاظت کے لیے عطا ہوا تھا۔

مستحسن تجسّس

رہے عام افراد تو ان کو اس باب میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

— جو تجسّس کسی کی بھلائی کی خاطر، نیک ارادہ، نیک مقصد سے ہو وہ، جیسا کہ ہم آیت کے تحت عرض کر چکے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ نہایت نیکی کا کام ہے۔ قرآن میں ہدایت ہے کہ خود دار غریبوں کی مدد کے لیے ان کو ڈھونڈھ کر خود ان کے پاس پہنچنے کی کوشش کرو۔ یہ توقع نہ رکھو کہ وہ تم سے لپٹ کر سوال کریں گے۔

— اگر کسی شخص کے متعلق یہ شبہ ہو کہ اس کی درپردہ سرگرمیاں دوسرے بے گناہ افراد کے جان و مال اور آبرو کے لیے خطرہ ہیں یا ملک کے امن، عدل اور سلامتی کو ان سے نقصان متصوّر ہے تو اس کو برا یا جھگڑا سمجھ کر اس سے بے تعلق نہیں رہنا چاہیے۔ اگر اصلاح کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو ان لوگوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اس کی اصلاح کر سکتے ہوں یا اس کا ہاتھ پکڑ سکتے ہوں یہ حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کشتی کے مسافروں والی تمثیل میں سمجھائی ہے۔

— اگر کسی شخص کی کوئی ایسی برائی علم میں آئے جو اس کی ذات ہی تک محدود ہو تو اس کو نصیحت کرے، اگر نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ اگر اس پوزیشن میں نہ ہو تو اس سے غضِّ بصر کرے اور پردہ ڈالے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے جو دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں لیکن اگر برائی متعدی نوعیت کی ہو تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرے جو انکارِ منکر

والی حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

قرآن و حدیث پر غور کرنے کا طریقہ

قرآن و حدیث کے سمجھنے میں لوگوں کو زیادہ مغالطہ اس وجہ سے پیش آتا ہے کہ آیات و احادیث کا موقع و محل معیّن کرنے میں لوگ تدبّر سے کام نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض حدیثوں میں اپنے مسلمان بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے لیکن کوئی صاحب مجرد اس حدیث کی بنا پر اگر یہ فتویٰ دے بیٹھیں کہ دوسروں کی نیکی بدی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، ہمیں صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے، کسی سے کوئی بدی ہمارے علم میں آئے بھی تو اس پر ہمیں پردہ ڈالنا چاہیے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہمارے گناہوں پر پردہ ڈالے گا، تو گو اس فتوے کی تائید میں ایک حدیث موجود ہے لیکن یہ فتویٰ ذہنوں میں بڑی الجھن پیدا کر دے گا، اس لیے کہ دوسری حدیثوں میں یہ بات بھی نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کر دے اگر اس کی طاقت رکھتا ہو، طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا سمجھے، اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

یہ الجھن ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیدا ہوگی کہ دونوں حدیثوں کا موقع و محل معیّن کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر دونوں کا موقع و محل معیّن ہو جائے تو کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی۔ ایک شخص کو اگر آپ دیکھتے ہیں کہ کھڑا ہو کر پیشاب کر رہا ہے تو یہ خیال کر کے غضِّ بصر بھی کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ کوئی عذر ہو۔ اگر عذر نہ واضح ہو تو اس کو عمدہ طریقہ سے نصیحت بھی کر سکتے ہیں کہ یہ طریقہ تہذیب و شائستگی اور اسلامی آدابِ طہارت کے خلاف ہے۔ اگر نصیحت کر سکنے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو اس کے اس اجڈپن پر پردہ ڈالیے، اس کا اشتہار نہ دیجیے۔ ان شاء اللہ آپ کی یہ پردہ پوشی آپ کے لیے عند اللہ موجب اجر ہوگی۔ لیکن ایک شخص کے متعلق اگر آپ یہ علم رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے گھر میں شراب کی بھٹی بنا رکھی ہے یا حشیش کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے یا اسلحہ چھپا رکھا ہے یا چکلہ قائم کر رکھا ہے اور آپ پولیس اور حکومت کو اطلاع دے سکنے کی پوزیشن میں ہونے کے باوجود اس خیال سے اس پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا تو میرے نزدیک یہ محض خوش فہمی ہے۔ اس طرح کی خوش فہمی میں پڑے ہوئے لوگ ثواب کمانا تو درکنار اپنے ایمان ہی گنوا بیٹھیں گے۔

غیبت کے باب میں بعض لوگوں کی غلط فہمی

غیبت کے باب میں بھی بعض لوگوں نے قلتِ تدبر کے سبب سے اسی نوع کا خلطِ مبحث پیدا کر دیا ہے۔ وہ غیبت کے حدود معیّن کرتے وقت بالکل بھول گئے کہ قرآن و حدیث میں جس طرح غیبت کی نہی وارد ہوئی ہے اسی طرح جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر، خیر خواہی

مسلمین کے احکام بھی نہایت مثبت اور قطعی الفاظ میں وارد ہوئے ہیں۔ جب ان دونوں میں تطبیق کا سوال پیدا ہوا اور کوئی تطبیق ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو انھوں نے یوں تطبیق پیدا کر ڈالی کہ ہیں تو یہ ساری باتیں داخلِ غیبت، لیکن یہ اس لیے مباح کر دی گئی ہیں کہ حکمتِ عملی ان کی مقتضی تھی۔ حالانکہ جرح و تعدیل، شہادتِ حق، انکارِ منکر اور نصیحِ مسلمین کے احکام مباحات میں سے نہیں بلکہ واجباتِ دین میں سے ہیں۔ اسلامی نظام کا سارا جمال و کمال انھی پر منحصر ہے۔ راویوں کی تحقیق اور جرح و تعدیل پر علمِ شریعت کی بنیاد ہے۔ شہادتِ حق اس امت کا وہ فریضۂ منصبی ہے جس کے لیے یہ دنیا میں برپا کی گئی ہے۔ انکارِ منکر کے ساتھ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس امت کے قیام و بقا کو وابستہ کیا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی خیر خواہی صرف اخوت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اسی سورہ میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ یہ ایمان کا بھی تقاضا ہے۔ یہ چیزیں امت پر غیبت کو مباح کر کے نہیں فرض کی گئی ہیں بلکہ ایمان کے تقاضوں کے تحت فرض کی گئی ہیں۔ رہی غیبت تو اس کا ایک خاص دائرہ ہے جس کی وضاحت آیت کے تحت ہم کر آئے ہیں۔ اس کی حرمت کسی پہلو سے بھی دین کے ان فرائض میں مخل یا مانع نہیں ہے کہ اس کو حکمتِ عملی کی خاطر مباح کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ نہ محدثین نے اس کو جائز قرار دیا ہے نہ مجددین و مصلحین نے اور نہ کسی مسلمان کو اپنے کسی دینی فرض کے ادا کرنے کے لیے کبھی اس کو مباح کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی۔ اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے تو ان لوگوں کو آ سکتی ہے جو اسلامی شریعت کو اپنی حکمتِ عملی کی بازیگاہ بنانا چاہتے ہوں۔

۶- آگے آیات ۱۴ - ۱۸ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں ان لوگوں کے باطن سے پردہ اٹھایا ہے جن کے رویہ پر ابتدائی پانچ آیات میں نکیر فرمائی ہے۔ وہاں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اطرافِ مدینہ کے بعض قبائل اسلام کی ابھرتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مسلمانوں میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن مرکز سے دور ہونے کے باعث ان کی تربیت اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر ان کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ وہ بغیر لڑے بھڑے اسلام میں داخل ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو اللہ و رسول کا محسن گمان کیے ہوئے بیٹھے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ادب و احترام کس طرح ملحوظ رکھ سکتے تھے جو ایمان کا مقتضی تھا۔ چنانچہ ان سے اس طرح کی باتیں صادر ہو جاتی تھیں جن پر ابتدائی آیات میں گرفت فرمائی گئی ہے لیکن اندازِ خطاب عام ہی رہا تاکہ جن کے اندر بھی یہ خامیاں ہوں وہ ان کی اصلاح کریں۔ چنانچہ یہ صورتِ حال جن باتوں کی تعلیم کی مقتضی ہوئی وہ بتا دی گئیں۔ اب آخر میں ان کے نام کی تصریح کے ساتھ ان کی اصل بیماری کا پتہ دے

دیا تاکہ وہ اس کے علاج کی طرف متوجہ ہوں اس لیے کہ اس بیماری کے ہوتے ایمان کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴ - ۱۸
قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا ۖ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا
وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۖ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَ
رَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ﴿١٤﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿١٥﴾ قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٦﴾ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا
عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٧﴾ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ ع ۲ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۴ - ۱۸
اہل بدو نے کہا کہ ہم ایمان لائے۔ ان کو بتا دو کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں یوں کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی اور ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے ذرا بھی کم نہیں کرے گا۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔ ۱۴ - ۱۵

کہہ دو، کیا تم اپنے دین سے اللہ کو آگاہ کر رہے ہو! درآنحالیکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۱۶

یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام لائے۔ کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی توفیق بخشی، اگر تم سچے ہو۔ اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے غیب کو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۷-۱۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴)

ان لوگوں کے غرور پر ضرب جو اپنے کو اسلام کا محسن سمجھتے تھے

'اعراب' سے مراد اطراف مدینہ کے وہی دیہاتی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرتے ہیں تو آپ کو اس طرح خطاب کرتے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنے برابر کے آدمی کو خطاب کرتا ہے۔ اگر کبھی آپ سے ملنے آتے ہیں تو آتے ہی ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بلا تاخیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کریں۔ یہاں تک کہ اگر آپ گھر کے اندر تشریف فرما ہوتے ہیں تو یہ انتظار کی زحمت اٹھانا گوارا نہیں کرتے بلکہ گھر کے باہر ہی سے آپ کو نام لے کر پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس گنوارپن میں جہاں تربیت سے محرومی کو دخل تھا وہیں اس بات کو بھی دخل تھا کہ یہ لوگ اس وہم میں مبتلا تھے کہ انھوں نے بغیر کسی جنگ و جدال کے اسلام میں داخل ہو کر آپ کے اوپر احسان کیا ہے جس کا صلہ ان کو یہ ملنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا اور اسلام کا محسن سمجھیں اور ہر موقع پر ان کی ناز برداری فرمائیں۔ ان لوگوں کی اسی ذہنیت پر یہاں ضرب لگائی جا رہی ہے۔

'قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا'۔ فرمایا کہ یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں! ان کے اس قول

کا حوالہ یہاں محض ان کے اقرارِ ایمان کی حیثیت سے نہیں دیا گیا ہے بلکہ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ بات وہ بطورِ اظہارِ احسان کہتے تھے۔ یعنی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بات بات میں یہ احسان جتاتے تھے کہ انھوں نے ایمان قبول کر کے آپ کی عزت و شوکت بڑھائی ہے۔ اس وجہ سے وہ حقدار ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ ان کا لحاظ فرمائیں اور جو مشورے وہ دیں ان کو بسر و چشم قبول کریں۔

'قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا' پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ان کو جواب دلوایا گیا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ تمھارا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ تم ایمان لائے ہو البتہ یہ دعویٰ تم کر سکتے ہو کہ تم نے اطاعت کر لی ہے۔ لفظ 'اسلام' یہاں اپنے لغوی مفہوم یعنی ظاہری اطاعت کے معنی میں ہے۔ اسلام کا حقیقی مفہوم تو اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینا ہے، لیکن یہ مجرد ظاہری اطاعت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ان دونوں معنوں کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان لوگوں کی نسبت ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں کہ دعوتِ ایمان سے زیادہ اسلام کی ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر یہ لوگ مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اس وجہ سے ایمان کی روح ان کے دلوں میں ابھی نہیں اتری تھی البتہ اسلام کے سیاسی اقتدار کے ماتحت یہ لوگ آ گئے تھے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جواب دیا کہ ایمان کا دعویٰ تو ابھی تمھیں زیب نہیں دیتا البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے اسلام کے اقتدار کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ اس جواب کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ جب تم نے اسلام کی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر اطاعت کی ہے تو یہ چیز جتانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ایک قسم کی مغلوبیت ہی ہے، بس یہ فرق ہے کہ تم بغیر مقابلہ کیے مغلوب ہو گئے اور یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کا احسان جتاؤ۔

ایمان کی حقیقت

'وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ' یعنی ابھی اپنے ایمان کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ۔ اس نے تمھارے دلوں کے دروازے پر دستک ضرور دی ہے لیکن وہ دلوں کے اندر گھسا نہیں ہے۔ یہ ایمان اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں معتبر ایمان وہ ہے جو رگ و پے میں اترے اور دل کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگ لے کہ اس سے الگ ہو کر سوچنا اور کوئی عمل کرنا انسان کے لیے آسان نہ رہ جائے۔

'وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا' یہ ان کے اظہارِ احسان پر تنبیہ ہے کہ اگر تم ایمان لائے یا تم نے اسلام کی کوئی خدمت کی تو اس کا احسان کیوں جتاؤ! اللہ تمھارے کسی عمل میں ذرا بھی کمی کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر چھوٹے بڑے عمل کا بھرپور صلہ دینے والا ہے۔ ایک کرو گے، ستر پاؤ گے۔ تمھارا ہر عمل تمھارے ہی کام آنے والا ہے، خدا کے کام آنے والا

نہیں ہے تو جب تم اپنا ہی کام کر رہے ہو تو اس کا احسان اللہ اور رسول پر کیوں رکھتے ہو!

إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔ وہ تمھاری کوتاہیوں اور خامیوں سے درگزر فرمائے گا، صلہ دینے میں ذرا بھی کمی نہیں کرے گا۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تمھارے اعمال کی قیمت کم کرنے کے لیے تمھارے چھوٹے چھوٹے نقائص کو بہانہ بنائے۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر اب تک تمھارے ذہن میں یہ غلطی سمائی رہی ہے کہ اسلام کے لیے تم نے جو کچھ کیا یہ اللہ اور رسول پر تمھارا احسان ہے تو اب اس تنبیہ کے بعد تم اس غلطی کی اصلاح کرو اور اللہ سے مغفرت مانگو، وہ تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۱۵)

حقیقی اہل ایمان کے اوصاف

فرمایا کہ ہر مدعی ایمان، اللہ کے نزدیک مومن نہیں بن سکتا۔ حقیقی مومن اللہ کے نزدیک وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر صدق دل سے ایمان لائے، پھر شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ مال و جان دونوں سے اللہ کی راہ میں برابر جہاد کیا۔ اپنا مال بھی دین کی تقویت و تائید کے لیے صرف کیا اور جان قربان کرنے کی نوبت آئی تو اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ فرمایا کہ یہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کا دعویٰ تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے ہیں لیکن اپنے تذبذب کے سبب سے اس راہ میں نہ کوئی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہیں اور نہ جان و مال کی قربانی کا کوئی حوصلہ رکھتے ہیں، وہ محض دکھاوے کے مجنوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ 'جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ' کا ذکر ان کے عدم تذبذب کی شہادت کے طور پر ہوا ہے۔ ایک شخص اگر ایک نصب العین کے لیے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا تو یہ ایک ناقابل انکار شہادت اس بات کی ہے کہ اس کو اس نصب العین کی صداقت پر پورا یقین ہے اور اگر وہ اس کی خاطر نہ مال قربان کرنے پر تیار ہے نہ اپنی جان کو کسی خطرے میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اگرچہ وہ اس کے عشق میں کتنی ہی لاف زنی کرے لیکن اس کا عمل گواہ ہے کہ وہ اس کے باب میں ابھی مبتلائے شک ہے۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۱۶)

یعنی یہ لوگ بڑے سرپرستانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں تو ان سے پوچھو کہ کیا

تم لوگ اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو! اگر یہ لوگ اللہ کو آگاہ کر رہے ہیں تو ان کو بتا دو کہ اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ ہر بات سے باخبر ہے۔ وہ فعلاً بھی ہر چیز کو جانتا ہے اور صفتاً بھی ہر بات سے باخبر ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو اپنے ایمان پر ناز ہے تو اس پر وہ کسی ایسے کے سامنے ناز کریں جو ان کے دین و ایمان سے بے خبر ہو۔ اس کے سامنے ناز کرنے سے کیا فائدہ جو اس کائنات کے ہر سرّ و علانیہ سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ کیا جو ہر چیز سے آگاہ ہے وہ ان کے ایمان کے طول و عرض سے آگاہ نہیں ہوگا۔

يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۖ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (١٧)

مدعیانِ احسان کو جواب

ان لوگوں کے دعوائے ایمان کی قلعی کھولنے کے بعد ان کے دعوائے اسلام کی حقیقت واضح فرمائی کہ یہ لوگ تمھارے اوپر (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے۔ یعنی ان کا زعم یہ ہے کہ اسلام لا کر انھوں نے پیغمبر کی عزت بڑھائی اور اسلام کو قوت و شوکت بخشی اس وجہ سے وہ پیغمبر اور اسلام دونوں کے محسن ہیں اور پیغمبر کا فرض ہے کہ وہ ان کے اس احسان کا احترام کریں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم لوگ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتاؤ۔ اگر تم فی الواقع اپنے دعوے میں سچے ہو تو تمھارا احسان میرے اوپر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تمھارے اوپر ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی توفیق بخشی۔ 'إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ' کے الفاظ پر نظر رہے، یعنی اول تو تمھارا ایمان و اسلام کا دعویٰ ہی محض لاف زنی ہے اور اگر تمھاری بات میں کچھ صداقت ہے تو تمھیں اللہ کا شکرگزار رہنا چاہیے کہ اس نے تمھیں اس کی توفیق بخشی۔ 'ھدایت' کے بعد 'ل' کا صلہ دلیل ہے کہ یہ لفظ یہاں توفیق کے مضمون پر متضمّن ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کی کوئی چھوٹی یا بڑی خدمت کر کے کوئی شخص نہ اللہ و رسول پر کوئی احسان کرتا نہ دین پر بلکہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے کہ اپنی عاقبت سنوارتا ہے۔ احسان، درحقیقت، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کہ وہ اس کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے کر اس کے لیے ابدی فیروزمندی کی راہ کھولتا ہے۔ یہاں اس بات پر بھی نظر رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ جواب نہیں دلوایا گیا کہ تم لوگ اپنے ایمان و اسلام کا احسان مجھے نہ جتاؤ، بلکہ میرا احسان تمھارے اوپر ہے کہ میں نے تمھارے سامنے ہدایت کی راہ کھولی۔ اگر یہ جواب دلوایا جاتا تو اس کا ایک محل تھا، لیکن نبی جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت

کی راہ پر لانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کر دے لیکن لوگوں کو ہدایت کی توفیق دینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کی توفیق بخشنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے اور معاملہ کا سارا انحصار اسی توفیق بخشی پر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸)

یہی آیت ۱۶ والا مضمون ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمایا کہ اپنے ایمان و اسلام کو زیادہ بتانے اور جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے سارے بھیدوں کو خود جانتا ہے اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز دعویٰ نہیں بلکہ عمل ہے۔ اگر عمل کرو گے تو تمہارا دعویٰ بغیر اظہار و اعلان کے اللہ کے ہاں ثابت ہو جائے گا اور اگر عمل نہیں کرو گے تو زبان سے کتنا ہی دعویٰ کرو، یہ بالکل بے حقیقت و بے سود ہوگا۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس گروپ کی آخری سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

رحمان آباد
۱۳؍ دسمبر ۱۹۷۶ء
۲۰؍ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ